8 ذوالحجہ 1441ھ | اگست 2020ء

جب تک کہ غیر حق کی یونہی بندگی ہے دوست
یہ زندگی بھی میری کوئی زندگی ہے دوست

اغلباً محرم ۱۳۲۵ھ دسمبر ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے۔ مولوی مظہر علی کے حلقۂ انتخاب میں تقریر کے لیے میں لاہور سے ڈسکہ جارہا تھا اور شورش کاشمیری میرے ساتھ تھا۔ لاری جارہی تھی تو میں نے اُسے مخاطب کر کے کہا: ''شورش! اس زندگی کا بھی کچھ فائدہ ہے جو کفر کے قانون کے ماتحت بسر ہو رہی ہے۔''

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت ملتان

جلد 31 شمارہ 08 اگست 2020ء / ذوالحجہ ۱۴۴۱ھ

Regd.M.NO.32

زرِ تعاون سالانہ

اندرون ملک ---- -/300 روپے
بیرون ملک ---- -/5000 روپے
فی شمارہ ---- -/30 روپے

ترسیلِ زر بنام: ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت

بذریعہ آن لائن اکاؤنٹ نمبر: 1-5278-100

بینک کوڈ 0278 یو بی ایل ایم ڈی اے چوک ملتان

## تشکیل



رابطہ

دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان
☎061-4511961

www.ahrar.org.pk
www.alakhir.com
majlisahrar@hotmail.com
majlisahrar@yahoo.com

شعبۂ تبلیغ تحفظِ ختمِ نبوۃ مجلسِ احرارِ اسلام پاکستان

مقامِ اشاعت: دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان ناشر: سید محمد کفیل بخاری طابع: تشکیل نو پرنٹرز

Dar-e-Bani Hashim, Mehrban Colony, Multan.(Pakistan)

سید محمد کفیل بخاری دل کی بات

# پنجاب اسمبلی میں ''تحفظ بنیادِ اسلام بل'' کی منظوری

22؍ جولائی 2020ء کو پنجاب اسمبلی میں ''تحفظ بنیادِ اسلام بل'' منظور ہوا۔ یہ قرارداد صوبائی وزیر جناب حافظ عمار یاسر نے پیش کی، جسے اپوزیشن اور حکومتی ارکانِ اسمبلی نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ یہ ایک خوش آئند اقدام ہے اور قیامِ پاکستان کے مقاصد کی تکمیل کی طرف قابلِ قدر پیش رفت ہے۔ اس سے قبل بھی پنجاب اسمبلی میں تحفظِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم، تحفظِ ناموسِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی کے ساتھ لفظ ''خاتم النبیین'' صلی اللہ علیہ وسلم لازمی لکھنے کے عنوان سے متعدد بل منظور ہو چکے ہیں۔ نیز مقدس شخصیات، قرآنِ کریم، انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں گستاخانہ مواد کی روک تھام کے لیے بھی قراردادیں منظور ہو چکی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان اقدامات کا اصل کریڈٹ سپیکر پنجاب اسمبلی جناب چودھری پرویز الٰہی، جناب حافظ عمار یاسر اور اُن کی پارلیمانی ٹیم کو جاتا ہے، جنھوں نے بڑے اخلاص کے ساتھ مرحلہ وار اس کام کو بطورِ مشن آگے بڑھایا۔ قبل ازیں سندھ اسمبلی نے سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی کے ساتھ ''خاتم النبیین'' کے قرآنی لفظ کو لازمی لکھنے کی قرارداد منظور کی۔ پھر پنجاب اسمبلی، قومی اسمبلی، سینٹ اور آزاد کشمیر اسمبلی نے اسے منظور کیا۔ حیرت ہے کہ بلوچستان اور خیبر پختونخوا کی اسمبلیاں ابھی تک خاموش ہیں۔ حالانکہ 1974ء میں سرحد اسمبلی نے قومی اسمبلی سے بھی پہلے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تھا اور سب سے پہلے 1973ء میں آزاد کشمیر اسمبلی سے سردار عبدالقیوم خان مرحوم نے قرارداد اقلیت منظور کرائی تھی۔ امید ہے کہ بلوچستان اور خیبر پختونخوا کی اسمبلیاں بھی مرکز اور دیگر صوبوں کی فوری تقلید کریں گی۔

میں اپنی جماعت مجلس احرارِ اسلام پاکستان کی طرف سے سپیکر پنجاب اسمبلی جناب چودھری پرویز الٰہی، صوبائی وزیر حافظ عمار یاسر اور ان کی پوری ٹیم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ وزیر اعلیٰ پنجاب عثمان بزدار کا بھی شکریہ، جنھوں نے صوبائی کابینہ سے اس بل کو منظور کرایا۔

سپیکر پنجاب اسمبلی جناب چودھری پرویز الٰہی کی یہ تجویز قابلِ توجہ ہے کہ اس بل کے سیکشن نمبر 3 شق F کو پاکستان پینل کوڈ 1860ء کی شق نمبر 295۔سی میں شامل کیا جائے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ وفاق اور تمام صوبے بھی پنجاب اسمبلی کی تقلید کرتے ہوئے اپنے اپنے فورمز پر ایسا ہی بل منظور کرائیں اور قانون سازی کر کے پورے پاکستان میں اسے نافذ کریں۔

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوا۔اس ملک کی بقاء و استحکام بھی تحفظِ اسلام اور نفاذِ اسلام سے ہی وابستہ ہے۔ پاکستان کا آئین اسلامی ہے۔لیکن اسلام آئین میں قید ہے، ملک میں نافذ نہیں۔آئین کا تقاضا ہے کہ پاکستان کو ایک مکمل اسلامی ریاست بنایا جائے۔ یہ تب ہی ممکن ہوگا جب حکمران آئین کی پاسداری کرتے ہوئے ملک میں عملاً اسلامی نظام نافذ کریں گے۔یقینی طور پر یہ فریضہ حکمرانوں پر ہی عائد ہوتا ہے۔اس لیے کہ قوتِ نافذہ انھی کے پاس ہے۔اللہ تعالیٰ ان کو توفیق دے کہ اس مقدس فرض سے عہدہ برآ ہوں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں جواب دہی ہوگی اور اس وقت سوائے نقصان کے ان کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔

عبداللطیف خالد چیمہ شذرہ

# ماتحت مجالس احرار اسلام متوجہ ہوں!

مجلس احرار اسلام پاکستان نے ضروری مشاورت کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ عیدالاضحیٰ کے بعد تنظیمی و جماعتی اور خصوصاً عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کی سرگرمیوں میں تیزی لائی جائے گی اور ایس او پیز کا لحاظ رکھتے ہوئے ۱۴؍اگست کو پاکستان کے یوم آزادی کی تقریبات منعقد کی جائیں گی جبکہ ۲۱؍اگست کو حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے یوم وصال کی مناسبت سے یوم امیر شریعت کی نشستوں کا اہتمام کیا جائے گا اور مجلس احرار اسلام کی روایات کے مطابق ۷؍ستمبر کو یوم تحفظ ختم نبوت اہتمام کے ساتھ منایا جائے گا۔ جبکہ یکم ستمبر تا دس ستمبر عشرۂ ختم نبوت منایا جائے گا۔اسی طرح مجلس احرار اسلام پاکستان کی مرکزی عاملہ کا اجلاس ۶؍ستمبر اتوار کو مرکزی دفتر لاہور میں منعقد ہوگا، جس میں تحریک ختم نبوت کی تازہ ترین صورتحال اور ملک کی عمومی سیاسی صورحال کا بغور جائزہ لیکر پالیسی مرتب کی جائے گی۔

احرار دوستو: اکابرین احرار نے جو امانت ہمارے سپرد کی ہم کما حقہ تو اس کا حق ادا نہیں کر پائے مگر پرچم احرار کو تھام کر چلنا شیوۂ احرار ہے یہی ہماری پہچان ہے، جس کو بعض مہربانوں نے بدلنے کی بڑی کوشش کی مگر قافلہ سخت جاں ہر دم اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔موجودہ سیاسی کشمکش میں احرار اپنی مستقل پالیسی پر گامزن ہے کہ نیکی کے ہر کام میں تعاون اور برائی کے ہر کام میں مزاحمت کریں گے۔یہی قرآنی اصول ہمارا دستور العمل ہے۔اس کو ہر حال میں ملحوظ خاطر اور مقدم رکھیں۔مزید یہ کہ موجودہ وبائی مرض سے مکمل نجات کیلئے اللہ کے حضور توبہ و استغفار کا اہتمام کریں۔رجوع الی اللہ کے سوا چارہ نہیں یہی ہمارے مسائل کا حتمی حل ہے۔زکوٰۃ سمیت صدقات واجبہ کی ادائیگی یقینی بنائیں اور نفلی صدقات و خیرات بڑھائیں۔نیز احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔اللہ تعالیٰ پوری امت کو معاف فرمادیں اور اپنا مطیع اور فرماں بردار بننے کی توفیق سے نوازیں، آمین، یارب العالمین!

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

# ایا صوفیا جامع...... یادیں اور باتیں

ستمبر 2014 میں شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی (جس کے صدر شعبہ ڈاکٹر خلیل طوقار ہیں) کی طرف سے منعقدہ ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کے لئے ترکی کے خوبصورت شہر استنبول پہنچے، میرے ساتھ میرے شعبہ (اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی) سے ڈاکٹر سہیل شفیق اور ڈاکٹر زیبا بھی تھیں۔ چار روزہ کانفرنس سے فراغت کے بعد ہم دو ہفتے مزید استنبول میں ٹھہرے اور بے تحاشا گھومے۔ تین دن تو ایسا ہوا کہ ہمارے مہمان سعید صاحب جو ترکی ہی کے ہیں، اپنی شاندار لینڈ کروزر میں صبح 9 بجے ہوٹل سے ہمیں لیتے اور رات نو بجے واپس چھوڑتے۔ ان بارہ گھنٹوں میں بس ہم گھومتے ہی رہتے۔ (مولانا رومی کے ملک میں جو تھے)۔ پہلے ہی دن ہم ایا صوفیا اور نیلی مسجد (ینی جامع) دیکھنے گئے۔

ایا صوفیا ماضی قریب میں استنبول کی سب سے بڑی جامع مسجد اور ماضی بعید میں مشرقی دنیائے نصرانیت کا سب سے ممتاز صدر کلیسا metropolitan Church تھا۔ یہ قسطنطین کے بیٹے قسطنطیوس نے 360ء میں بنوایا تھا۔ یہ "کنیسہ عظمی" متعدد اور مختلف تغیرات سے دوچار ہوتا رہا۔ کئی بار آگ اور زلزلوں سے تباہ ہوا اور کئی بار مختلف عیسائی مسلکوں کی لڑائیوں میں۔ بالآخر جسٹینین Justinian نے اس کی تعمیر نو کی، ملک کے دو ماہر تعمیرات کو اس کی ذمہ داری دی گئی اور رومی بادشاہ نے انہیں تاکید کی کہ تعمیر اتنی پائیدار ہونی چاہیے کہ نہ زلزلہ اثر کرے نہ آتش زدگی۔ تعمیر کئی سال میں مکمل ہوئی، بہت ہی شان وشوکت سے 27۔ دسمبر 537ء کو اس کا جشن افتتاح منایا گیا۔ جسٹینین نے بڑے فخر سے اس موقع پر حضرت سلیمان علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا: "اے سلیمان! میں آپ سے بازی لے گیا"۔ یاد رہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ھیکل بیت المقدس تعمیر کیا تھا۔ 7۔ مئی 558ء کو پھر زلزلہ آیا اور ایا صوفیا کا مشرقی حصہ گر گیا۔ (پتا نہیں پیارے جسٹینین نے اس وقت کیا کہا ہوگا) دوبارہ تعمیر زیادہ مضبوط بنیادوں پر کی گئی، دوبارہ اس کا افتتاح 24 دسمبر 562ء کو ہوا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ جس مقام پر یہ دیوہیکل کلیسا تعمیر کیا گیا تھا وہ fault line یعنی زلزلے کی پٹی پر تھا، بلکہ ہے۔

رومی بادشاہوں نے اس کی تزئین و آرائش میں اس قدر غلو کیا تھا کہ قرون وسطی کا زائر اسے دیکھ کر مبہوت رہ جاتا تھا۔ ہر جگہ سنگ مرمر کا بکثرت استعمال، حضرت عیسی، حضرت مریم، دیگر انبیاء...... حواریوں اور اولیاء کی تصاویر، اس پر مستزاد فرشتوں کے طبقہ اشراف (seraphim) کی تماثیل سے معلوم ہوتا تھا کہ دیواروں پر رنگوں کا ایک سمندر موجزن ہے، طلائی پچی کاری سے گنبد اور دیواروں کو مزین کیا گیا تھا۔ 1204ء میں جب قسطنطنیہ کو لاطینی صلیبی جنگجوؤں نے تاراج کیا تو اس گرجا کو بھی شدید نقصان پہنچا اور اسے سنگدلی سے لوٹا گیا۔

جب ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیا (29۔ مئی 1453) تو بہت سے لوگوں نے اس کلیسا میں پناہ لی، ان کا عقیدہ

تھا کہ فاتحین جب قسطنطین اعظم کے مینار تک پہنچ جائیں گے تو فرشتے انہیں آگے بڑھنے سے روکیں گے اور انہیں ان کے علاقوں کی طرف دھکیل دیں گے۔لیکن ترک فوجی ایا صوفیا میں داخل ہوئے اور پناہ گزینوں کو محفوظ مقام پر منتقل کیا، عینی گواہوں سے ایا صوفیا میں کسی خون خرابے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔

سلطان محمد فاتح نے ایا صوفیا کو جب مسجد بنانے کا حکم دیا ہوگا تو اس میں بڑی تبدیلیاں کرنی پڑی ہوں گی...... یہ تبدیلیاں بتدریج ہوتی رہیں سب سے پہلے تو اندرونی دیواروں پر منقش انسانوں اور فرشتوں کی تصاویر کو اس ہنر مندی سے چھپانے کا مسئلہ تھا کہ وہاں نماز کی ادائیگی کی جاسکے۔اس کے لئے ایک مخصوص قلعی تیار کی گئی جو دیواروں پر کی گئی، یعنی ان تصاویر کو کھرچ کر معدوم کرنے کے بجائے چھپا دیا گیا۔بعد میں بیرونی اطراف میں چار مینار تعمیر کئے گئے، جو آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔کلیسا کے انتہائی بلندی پر نصب ''کراس'' کو''ہلال'' سے بدل دیا گیا۔

ایک اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ استنبول کی کسی بھی مسجد یا گرجا میں آپ نماز پڑھیں تو آپ کا رخ بیک وقت بیت المقدس (قبلہ اول) اور خانہ کعبہ کی طرف ہوگا، لہذا یہاں ترک قبلے میں فرق کی وجہ سے تھوڑا سا جنوب کی طرف ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔

بیشتر عثمانی سلاطین نے ایا صوفیا کی مضبوطی اور تزئین و آرائش میں حصہ لیا۔سلطان مراد ثالث کے زمانے میں پوری مسجد کی مرمت ہوئی اور دو بڑے چبوترے اپنے ذاتی خرچ سے بنوائے۔اس نے ایا صوفیا کے گنبد کی چوٹی پر لگے "ہلال" پر سونے کا پترا چڑھایا۔

سلطان مراد رابع کے زمانے میں (1623-1640) خالی اندرونی دیواروں کو قرآنی آیات کی خطاطی سے مزین کیا گیا۔عثمانیوں کے مشہور خطاط بچاق جی زادہ مصطفے چلپی سے بڑے بڑے سنہری حروف میں قرآنی آیات لکھوائی گئیں۔چونکہ ایا صوفیا کی دیواریں بہت ہی بلند ہیں تو خطاطی یا کسی بھی قسم کی نقش گری انتہائی دشوار ہے۔مثلاً حرف ''ا'' الف کی لمبائی 37 فٹ ہے، اس سے آپ مزید اندازہ لگالیں۔ایا صوفیا میں ایک مقصورے کا اضافہ سلطان احمد ثالث کے زمانے میں ہوا تھا۔سلطان محمود اول نے مسجد میں ایک شاندار فوارہ، اوپری منزل تک جانے کے لئے سلطانی گزرگاہ، ایک مدرسہ اور ایک کتب خانہ بنوایا۔1847 میں سلطان عبدالمجید نے اطالوی ماہرین سے مسجد کی renovation کرائی۔عثمانیوں کے دور میں رمضان المبارک کے مہینے میں ایا صوفیا کی سج دھج، چکا چوند، اور رونقیں عروج پر ہوتی تھیں۔

ہم ایا صوفیا کی سیر کرتے ہوئے جب اوپر جانے لگے تو پتا چلا کہ پتھروں کی بنی ہوئی ڈھلوان کے ذریعے اوپر جانا ہوگا۔ایا صوفیاء کی بالائی منزل ایسی نہیں ہے جیسے ہمارے گھروں کی بالائی منزل ہوتی ہے، پندرہ بیس سیڑھیوں کے بعد بالائی منزل آجاتی ہے، یہاں بالائی منزل کا مطلب تھا کہ کئی منازل کی بلندی...... ویسے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن ایک دن قبل ہی گرنے کی وجہ سے میرے بائیں پاوں میں شدید موچ آئی ہوئی تھی جس پر ڈاکٹر نے پریشر بینڈج کر کے تین چار دن آرام کا مشورہ دیا تھا۔لیکن شوق کا کیا مول۔میں یہ ریمپ چڑھ گئی، بالائی منزل پر وسیع گیلریاں تھیں جہاں ہزاروں کی

تعداد میں لوگ بیٹھ سکتے تھے، یہ رومیوں کے زمانے میں سیاسی اور مذہبی اجتماعات کے لئے استعمال ہوتی ہوں گی۔

2014 میں جبکہ ہم یہاں گئے، ایا صوفیا میوزیم تھا، تاہم اردگان حکومت نے ایک چھوٹی سی عقبی جگہ نماز کے لئے کھلوادی تھی۔ ایا صوفیا میں جب سے اسے میوزیم بنایا گیا تھا یہاں نماز اور اذان پر پابندی تھی۔ ہم نے اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دو رکعت نماز ادا کی اور ایا صوفیا کی خوبصورت یادیں لے کر اگلی منزل کو روانہ ہو گئے۔

**ایا صوفیا کو مسجد بنانے کا حالیہ فیصلہ، پس منظر کیا ہے؟**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث صحابہ کرام میں گردش کر رہی تھی: "تم قسطنطنیہ کو ضرور فتح کر لو گے، رحمت ہو اس بادشاہ اور اس لشکر پر جس کے ہاتھوں یہ فتح نصیب ہو"۔ لہذا قسطنطنیہ پر قبضے کی کوششیں حضرت امیر معاویہ کے زمانے ہی سے شروع ہو گئی تھیں، قسطنطنیہ پر سب سے زیادہ حملے اموی دور میں ہوئے، دو بار قسطنطنیہ کا محاصرہ عباسی دور میں کیا گیا، تین بار یہ محاصرہ اور حملہ عثمانی دور میں، محمد فاتح سے پہلے ہوئے۔ یہاں تک کے ساتویں عثمانی سلطان محمد فاتح نے 29 مئی 1453ء کو قسطنطنیہ ایک طویل محاصرے اور شدید جنگ کے بعد فتح کر لیا اس وقت نوجوان فاتح کی عمر صرف 22 سال تھی۔ یہ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط کا واقعہ ہے، اس وقت کے اصول صلح و جنگ میں یہ طے تھا (بلکہ اسلامی فقہ کے مطابق بھی تھا) کہ کسی بھی علاقے پر قبضے کی دو صورتیں تھیں۔

1: وہ علاقہ/شہر/ملک صلح سے فتح ہو۔ ایسا اس وقت ہوتا جب کوئی حملہ آور فوج کسی شہر یا قلعے کے پاس پہنچتی تو اہل شہر مدافعت کی طاقت نہ پاتے ہوئے حملہ آور فوج سے مذاکرات کرتے کہ تم ہمارا شہر کچھ شرائط کی بنیاد پر لے لو، ہم جنگ نہیں چاہتے۔ فریقین میں کچھ شرائط پر معاہدہ طے پا جاتا۔ جس کی پاسداری فریقین کو کرنی پڑتی۔ عام طور پر یہ شرائط طے ہوتے کہ فاتح قوم پوری آبادی کو امان دے گی...... ان کے معابد سے تعرض نہیں کرے گی وغیرہ وغیرہ۔

جیسا کہ بیت المقدس کی فتح میں ہوا تھا۔ اسلامی فوج شام کے مختلف علاقے فتح کرتی ہوئی جب فلسطین پہنچی تو اہل فلسطین نے مسلمانوں سے کہا کہ ہم شہر حوالے کرنے پر تیار ہیں، بشرطیکہ صلح نامہ لکھنے کے لئے تمھارے خلیفہ ہمارے پاس آئیں۔ حضرت عمر مدینہ سے فلسطین پہنچے...... معاہدہ طے پا گیا کہ اہل شہر کی جان و مال سے تعرض نہیں کیا جائے گا بلکہ انہیں مکمل امان حاصل ہوگی...... وہ اپنی پیداوار پر اتنا ٹیکس حکومت کو دیں گے...... اور ان کے معبد سے تعرض نہیں کیا جائے گا البتہ انہیں نئے کنیسہ بنانے کی اجازت نہیں ہوگی وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس کی حیثیت تبدیل نہیں کی گئی، حضرت عمر نے وہاں نماز بھی نہیں پڑھی کی صلح نامے کی پاسداری مطلوب تھی۔

2: دوسرا جنگی قاعدہ یہ تھا کہ فریقین جنگ ہی کریں۔ ایسی صورت میں جو ہار گیا اب اس کے پاس کسی بات کا کوئی اختیار نہیں رہ گیا۔ جو فاتح رہا، اب یہ اس کی صوابدید ہے کہ اسیروں کو غلام بنا کر بیچ دیں یا رہا کر دیں۔ انہیں امان دیں یا نہ دیں...... ان کے معابد قائم رہنے دیں یا نہ رہنے دیں۔

اس بات کو ذہن میں رکھئے کہ یہ پندرھویں صدی عیسوی کا وسط ہے، اس سے قبل تیرھویں صدی عیسوی میں

مسلمانانِ اندلس کے ایک ایک شہر پر رفتہ رفتہ عیسائی فوجیں قبضہ کر چکی تھیں، سب سے پہلے انہوں نے طلیطلہ فتح کیا...... وہاں کی عظیم الشان جامع مسجد کو گرجا میں بدل دیا گیا۔ اس کے بعد قرطبہ 1236ء میں فتح ہو گیا اور وہاں کی شاندار مسجد قرطبہ کو کنیسہ کا درجہ دے دیا گیا۔ یہ وہی مسجد ہے جس کے لئے اقبال نے کہا تھا

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلہ روز و شب، اصل حیات و ممات
سلسلہ روز و شب، تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات، اپنی قبائے صفات

یہی اندلس کی دوسری مسلم ریاستوں کے ساتھ ہوا، یہاں تک کہ 1492 میں غرناطہ فتح اور وہاں کی شاندار مساجد (ایک نہیں تمام مساجد) کو یا بند کر دیا گیا یا کنیسہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے انتقام میں محمد فاتح نے ایا صوفیا کو مسجد بنا دیا، کہ عیسائیوں نے ایسا کیا تو اب ہم بھی ایسا ہی کریں گے۔ بلکہ اسپین کی مثال سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قرن وسطی میں اصول جنگ یہی تھے۔ قسطنطنیہ کی فتح کے تین دن بعد جب جمعہ کے دن محمد فاتح قسطنطنیہ میں داخل ہوا تو جمعہ کے انعقاد کے لئے ایا صوفیا گیا، وہیں جمعہ منعقد ہوا اور ایا صوفیا کو مسجد کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ چند روز قسطنطنیہ میں ٹھہر کر اور وہاں ایک انتظامیہ بنا کر محمد فاتح واپس برصہ چلا گیا، جو اس کا دارالحکومت تھا۔

فیس بک پر کچھ کاغذات دکھائے جا رہے ہیں کہ ایا صوفیا کو محمد فاتح نے عیسائی پادریوں سے خرید لیا تھا، یہ بات logical نہیں۔ ایک ایا صوفیا کیا جب پورا قسطنطنیہ ہی قبضے میں آ گیا تھا، اور ہر چیز سے عیسائیوں کی حق ملکیت کا خاتمہ ہو چکا تھا تو وہ کسی چیز کی خرید و فروخت کی پوزیشن ہی میں نہیں تھے۔

1453ء سے 1934 تک ایا صوفیا مسجد رہی۔ 1934 میں مصطفے کمال پاشا کی کابینہ نے اسے میوزیم کی شکل دے دی۔ 2020 میں رجب طیب اردگان نے اس میوزیم سے دوبارا مسجد بنا دیا، یہ فیصلہ ترکی کی اعلی عدالت نے کیا ہے۔ عالمی طاقتوں یعنی روس، امریکہ، اور مسیحی دنیا کا اردگان پر بڑا دباؤ تھا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ اردگان نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا۔ ترکی اپنے اندرونی معاملات میں آزاد ہے۔ کیا آزاد ملکوں کو اپنی داخلہ بلکہ خارجہ پالیسی بھی ان استعمار پسند ممالک سے پوچھ کر طے کرنی پڑے گی؟ جبکہ اردگان نے یہ بیان بھی دیا ہے کہ ایا صوفیا مسجد سب کیلئے کھلی ہوئی ہے۔ یہاں عیسائی اور دیگر غیر مسلم سب آ سکتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ استعماری طاقتوں کے خریدنے کے پیمانے اور...... بیچنے کے اور ہیں۔ وہ جموں وکشمیر کے مسئلے کو ہندوستان کا اندرونی معاملہ قرار دیتے ہیں اور ایا صوفیا کے معاملے میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔

مسجد بنانے کا فیصلہ، چند پہلو:

ایا صوفیا کے حوالے سے اردگان حکومت کے حالیہ فیصلے پر مسلمانوں کی اکثریت نے اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا

ہے۔ وہ جولائی کی اس تاریخ کا انتظار کر رہے ہیں جب وہاں (یعنی استنبول کی سب سے بڑی جامع مسجد میں) نماز کی ادائیگی ہو سکے گی لیکن پاکستان میں ایک طبقہ اس پر مسلسل تنقید کر رہا ہے۔ یہ تنقید برائے تنقید ہے کیونکہ آپ اس فیصلے کے جس پہلو کا جائزہ لیں آپ کو یہ فیصلہ مبنی برحق ہی نظر آئے گا۔

**1۔ سیاسی پہلو:**

یہ ہے کہ ترکی ایک آزاد ملک ہے۔ اُسے اپنے فیصلوں میں سو فیصد آزاد ہونا چاہیے اور عالمی برادری کو اُس کی اس خودمختاری کا احترام کرنا چاہیے۔ یہ ترکی کی داخلی آزادی کا احترام ہی تھا کہ جب 1934ء میں اس وقت کی پارلیمنٹ نے مسجد ایاصوفیا کو میوزیم بنانے کا فیصلہ کیا تو اُس فیصلے پر باوجود اس کے لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمانوں کو اس فیصلے سے تکلیف ہوئی، انہوں نے اس تکلیف کا اظہار بھی کیا لیکن ترکی کی سیاسی آزادی و خودمختاری کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس فیصلے کو برداشت کیا گیا، اسی اسپرٹ کا مظاہرہ اب ہونا چاہیے کہ یہ ترکی کا داخلی سیاسی معاملہ ہے۔

**2۔ قانونی پہلو:**

قانون صحیح بھی ہو سکتا ہے، غلط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ قوانین انسانی کاوشیں ہیں اور انسانی عقل غلطی کر سکتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نبوت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ 1934ء کا فیصلہ بہتوں کے نزدیک درست اور بہتوں کے نزدیک غلط تھا۔ تاہم یہ ایک غیر متنازعہ اصول ہے کہ ''عدالتی فیصلوں کا احترام کیا جائے گا'' لہٰذا ترکی کی اعلیٰ انتظامی عدالت کے اس فیصلے کا بھی غیر مشروط احترام ہونا چاہیے۔

**3۔ اخلاقی پہلو:**

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''اخلاق'' ہی فاتح عالم ہے۔ بعثتِ محمدی کے وقت عرب کے عربوں کے پاس آخر کیا تھا؟ کیا ان کے پاس اس دور کی ٹیکنالوجی تھی؟ کیا ان کے پاس ایران جیسے مستحکم سیاسی ادارے تھے؟ کیا ان کے پاس بازنطینیوں جیسے فوجی، جنگی آلات حرب و ضرب تھے؟ لے دے کے ان کے پاس وہ اخلاقی اصول ہی تھے جس کے بل بوتے پر فقط ساٹھ، پینسٹھ سال کے عرصے میں وہ متمدن عصری اقوام پر غالب آ گئے۔ ساسانیوں (ایران) جیسی طاقت کو انہوں نے فتح کر لیا، عراق فتح کیا، پورا شام فتح کیا جو بازنطینیوں کا علاقہ تھا، مصر فتح کیا یہ بھی بازنطینیوں کا علاقہ تھا اور یہ سب کچھ اُس اخلاقی برتری کا نتیجہ تھا جو اُس وقت کے مسلمانوں کو دیگر عصری اقوام پر حاصل تھی۔

ایاصوفیا کے بارے میں حالیہ فیصلے کو ایک گروہ اخلاقی بنیادوں پر رد کر رہا ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ اس فیصلے سے عیسائی دنیا کو تکلیف پہنچے گی۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ فیصلہ اخلاقی اصولوں کے خلاف ہے... انسانیت کو اس سے غلط پیغام جائے گا۔ اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ یہ کسی کنیسہ کو مسجد بنانے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ میوزیم کو مسجد بنایا جا رہا ہے۔ نصرانی دنیا کا اس سے کیا لینا دینا؟ لہٰذا اخلاقی پہلو تو سب سے بودا پہلو ہے جس پر مذکورہ گروہ اپنے دلائل و براہین کی عمارت کھڑی کر رہا ہے۔

حفیظ اللہ خان نیازی

# بھٹو صاحب اور قادیانیت

پاکستان کے سابق وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے بہت سے کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ جو قادیانیوں کو اقلیت قرار دینا ہے۔ ان کی جگہ اگر کوئی دوسرا لیڈر حکمران ہوتا، تو وہ اتنا بڑا اقدام شاید نہ اٹھا پاتا۔ یہ پہلو ذہن میں رہے کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں قادیانیوں نے پیپلز پارٹی کی حمایت کی تھی اور اسی لیے انھیں امیدیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ وہ بھٹو کو اپنا ''خاص بندہ'' سمجھتے اور باور کراتے اور عام طور پر یہ کہتے تھے: ''ہم نے تن، من، دھن سے پیپلز پارٹی کی مدد کی تھی اور اب بھٹو صاحب کی جانب سے ادائیگی واپس کرنے کا وقت آ گیا ہے''۔ لیکن بھٹو صاحب نے لیپا پوتی کر کے قوم کو چکر دینے کے بجائے، مسئلہ قومی اسمبلی میں پیش کر دیا۔ جولائی، اگست اور ستمبر ۱۹۷۴ء کے دوران پوری قومی اسمبلی پر مشتمل اسپیشل کمیٹی کی کارروائی (۸/اگست تا ۷/ستمبر ۱۹۷۴ء) کے متفقہ فیصلے کے ذریعے قادیانیوں کو آئینی طور پر غیر مسلم قرار دینے کا اعلان کر دیا۔

اس حوالے سے ایک اہم یادداشت کو قومی امانت جانتے ہوئے، قوم کے حوالے کرنا میری ذمہ داری ہے۔

تحریکِ پاکستان کے ممتاز رہنما، آل انڈیا مسلم لیگ کے پارلیمنٹری سیکرٹری اور دسمبر ۱۹۷۴ء میں کراچی سے قومی اسمبلی کے منتخب رکن محترم مولانا ظفر احمد انصاری (۱۹۰۸ء۔۱۹۹۱ء) سے اسلام آباد میں میرا (۱۹۷۲ء تا ۱۹۷۷ء) تقریباً روزانہ رابطہ رہتا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں، مَیں قائد اعظم یونی ورسٹی اسلام آباد کی اسٹوڈنٹس یونین کا صدر تھا۔ گورنمنٹ ہوسٹل اسلام آباد میں عصر سے مغرب تک انصاری صاحب کی رفاقت سے فیض یاب ہوتا تھا۔ اگر وہ سوئے ہوتے تھے تو دروازہ کھٹکھٹا کر انھیں جگانا، چائے منگوانا اور پھر مولانا کی صحبت میں گفتگو سے استفادہ کرنا میرا معمول تھا۔ ہم اکثر مغرب کی نماز بھی اکٹھے پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں وہ بہت کم کراچی جاتے۔ بھٹو صاحب کے ساتھ انصاری صاحب کی دوستی بہت گہری اور باہمی احترام پر استوار تھی۔ بھٹو صاحب قومی، دستوری اور مذہبی معاملات میں ان پر بہت زیادہ اعتماد کرنے کے باوجود بعض سیاسی آرا پر اختلاف بھی رکھتے تھے۔ میرا حلقۂ احباب، انصاری صاحب کی بھٹو صاحب سے قربت پر ناراض رہتا تھا: ''انھوں نے قومی اسمبلی میں آ کر، بھٹو جیسے آدمی کے ساتھ دوستی کیوں رکھی ہے؟''

اگست ۱۹۷۴ء کے آخری ہفتے کی بات ہے کہ ایک دن حسب معمول جب میں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب سے ملنے گیا تو وہ میرے پہنچنے سے قبل ہی میرے لیے پیغام چھوڑ کر کہیں گئے ہوئے تھے کہ ان کا انتظار کروں۔ یاد رہے ان دنوں ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختم نبوت زوروں پر تھی اور قومی اسمبلی، قادیانیت کے مسئلے پر فریقین کے بیانات کی سماعت کر رہی تھی۔ (اس تحریک کا فوری سبب یہ بنا کہ اسلامی جمعیت طلبہ کی حمایت یافتہ اسٹوڈنٹس یونین، نشتر میڈیکل کالج ملتان کے زیر اہتمام، کالج کے طلبہ سیاحتی سفر کے بعد ریل گاڑی سے واپس ملتان آ رہے تھے۔ ۲۹/مئی ۱۹۷۴ء کو جیسے ہی ان کی گاڑی

چناب ایکسپریس، ربوہ ریلوے اسٹیشن پر رُکی تو قادیانی نوجوانوں نے مذکورہ طلبہ کی بوگی نمبر ۴۰۵۵ پر آہنی سلاخوں اور ڈنڈوں سے حملہ کر دیا، جس میں ۵۰ طلبہ شدید زخمی ہو گئے۔ اس اشتعال انگیز کارروائی پر طالب علموں کی احتجاجی تحریک، ملک گیر تحریکِ ختم نبوت میں تبدیل ہوگئی۔ادارہ)

جب انصاری صاحب واپس آئے تو انھیں کچھ پریشان پایا۔ میں یہ سمجھا کہ عمر کی وجہ سے تھکاوٹ ہوگی کہ آج دوپہر کو وہ سو نہ سکے تھے۔ میں انھیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا، جس پر جواباً انصاری صاحب کہنے لگے کہ ''میرے اس وقت اوسان خطا ہیں اور عجیب وغریب صورتِ حال سے دوچار ہوکر آیا ہوں''۔ میں نے پوچھا: ''جی! کیا ہوا؟ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ پرائم منسٹر ہاؤس سے ایک گاڑی آپ کو لینے آئی تھی۔ یقیناً بھٹو صاحب نے کسی بات چیت کے لیے بلایا ہوگا''۔

مولانا انصاری صاحب نے اثباتاً کہا: ''بھٹو صاحب کی طرف سے پیغام ملا تھا کہ قادیانیوں کا ایک بہت بڑا وفد انھیں (بھٹو صاحب سے) ملنے آرہا ہے، اس لیے فوری طور پر وزیراعظم ہاؤس پہنچ جائیں''۔ دراصل بھٹو صاحب قادیانی وفد سے ملاقات کرنے سے پہلے متوقع امور پر انصاری صاحب سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔

مولانا انصاری صاحب نے بتایا: ''میٹنگ ہال میں قادیانی وفد آچکا تھا اور بھٹو صاحب کی کرسی خالی پڑی تھی۔ بھٹو صاحب نے بیٹھتے ہی وفد کی طرف متوجہ ہوکر پوچھا' جی، بتائیں کیا بات ہے؟''

قادیانی وفد کے سربراہ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا: ''بڑا کڑا وقت ہے۔ آپ پر بھی دباؤ ہے، ہمارا وقت آپ کے ساتھ بڑا اچھا گزرا ہے اور ہم آپ کو اس مشکل سے نکالنا چاہتے ہیں''۔ ساتھ ہی وفد کے سربراہ نے ایک یادداشت کا مسودہ بھٹو صاحب کو پیش کرتے ہوئے کہا: ''ہم ایک حل لے کر آئے ہیں۔ آپ پارلیمنٹ میں آئینی ترمیم کے بجائے ہماری تجویز کردہ سفارشات کسی طور پر اسمبلی سے منوالیں، اس طرح آپ بھی مشکل سے نکل آئیں گے اور یوں درمیانی راستے سے ہمارے لیے بھی بچت ہوجائے گی''۔

بھٹو صاحب نے قادیانیوں کا پیش کردہ مسودہ لیا، پڑھا اور پھر اس کاغذ کو ہاتھ میں موڑ توڑ کر کہا:

Do you people really believe that bastard was a prophet ?

یہ کہہ کر بھٹو صاحب اٹھ کر میٹنگ ہال سے باہر چلے گئے''۔

مولانا انصاری صاحب نے بتایا کہ اس قادیانی وفد میں بڑے اثر ورسوخ والے افراد، جرنیل اور طاقت ور بیورو کریٹ شامل تھے، لیکن بھٹو صاحب نے ان کی ذرّہ برابر پروا نہیں کی اور اپنے دلی جذبات کا برملا اظہار کر دیا۔

مولانا ظفر احمد انصاری صاحب نے یہ سب کچھ اسی روز ملاقات کے تقریباً آدھ پون گھنٹے بعد مجھے بتا دیا تھا، جس سے ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ بھٹو کے دل میں اب قادیانیوں کے لیے کوئی نرم گوشہ باقی نہیں رہا ہے اور آئینی ترمیم کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے گا اور جہاں تک مولانا انصاری صاحب کی پریشانی کا تعلق ہے، تو اس کا سبب یہ تھا کہ یہ گروہ حکومت کو اور خود ریاست پاکستان کو کہیں نقصان پہنچانے کی مذموم کوشش نہ کرے۔

(ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن، جون ۲۰۲۰ء)

---

محمد اسامہ قاسم

# خواجہ آصف اور مسلم لیگ کی مسلم کش تاریخ

ان روزوں مسلم لیگ ن اگر چہ اپنے قائدین کی بدعملیوں کے وبال میں شدید سیاسی ناکامی کا شکار ہے مگر اس کی صف قیادت میں کہیں کوئی ندامت یا کسی قسم کی اصلاحِ احوال کی کوشش نظر نہیں آرہی۔ مسلم لیگ کا مردہ گھوڑا ہمیشہ فوجی آمروں کے زیرِ زانو رہا ہے۔ ایوب خان سے لے کر ضیاء الحق تک سبھی آمروں نے اس گھوڑے میں بہت جان ڈالی اور خوب دوڑایا۔ مسلم لیگ نے پاکستان میں سب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ اسلام کا نام لے کر نفاذِ اسلام کا راستہ روکا اور مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ 1953ء کی تحریک ختم نبوت میں مسلم لیگ ہی کے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے پہلا مارشل لاء لگا کر دس ہزار مسلمانوں کو جرمِ عشقِ محمد میں شہید کیا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ مسلم لیگ کے قائد نواز شریف نے قادیانیوں کو اپنا بھائی کہا اور ختم نبوت سے متعلق قوانین کو عالمی استعمار کی خوشنودی کے لیے ختم کرنے کوشش کی، جن میں حلف نامۂ ختم نبوت کا معاملہ سرفہرست ہے۔ مسلم لیگ کے موجودہ قائد میاں شہباز شریف کا پنجاب کی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے کے لیے برطانیہ سے قادیانی ماہر درآمد کرنا بھی ہمیں بھولا نہیں۔

پاکستان کی سیاست گواہ ہے کہ مسلم لیگ ہمیشہ تاریخ کی غلط سمت کھڑی رہنے والی جماعت ہے۔ دین بیزاری ہو، علماء دشمنی ہو، سامراج دوستی اور استعمار پرستی ہو یا بدنہاد آمروں کی خوشامد...... یہ مسلم لیگ کے آپریٹنگ سسٹم کے اندرونی وائرس ہیں۔ آج کل مسلم لیگ کی اس تاریخی بیماری کا مظہر خواجہ آصف ہیں۔ کبھی موصوف نے ظفر اللہ قادیانی کے حوالے سے اسمبلی فلور پر بات کی، کبھی امریکہ کے سامنے اچھا بچہ بننے کے لیے اسامہ بن لادن پر تبرا کیا، پھر مذہب اسلام کو سب مذاہب کے برابر قرار دیا۔ سب سے دل چسپ قصہ وہ تھا جب موصوف نے تحریک پاکستان میں علماء کے کردار پر تبصرہ کیا کہ مولوی لوگ تو دوقومی نظریے کے ہی مخالف تھے اور پھر اسلام آباد میں مندر کی تعمیر کی تائید کرتے ہوئے معلوم نہیں موصوف کون سے دوقومی نظریے کے چیمپئن بنے۔ اگر سب مذاہب برابر ہیں اور ملک ایک ہی قوم کی تشکیل کرتا ہے تو پاکستان کیا صرف شاہ عالمی بازار کے ہندوؤں کی دکانیں لوٹنے کے لیے بنایا گیا تھا؟

چونکہ پاکستان میں سیاست کا معیار جہالت ورعونت ہے (کہ سب سے بڑے جاہل کو سب سے بڑا عہدہ تفویض کیا جاتا ہے) اس لیے ہمیں ان کی لاعلمی پر حیرت نہیں۔ خواجہ صاحب پاکستان کے قومی شاعر علامہ اقبال مرحوم کے شہر سے منتخب ہونے کے باوجود ہرگز یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ علامہ اقبال نے بہت پہلے فرمایا تھا کہ: ''قادیانیت، یہودیت کا چربہ ہے''۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے ہوں گے پاکستان کے قادیانی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ نے اپنے دور میں پاکستانی سفارت

خانوں کو قادیانی تبلیغی مراکز میں تبدیل کر دیا، یہودیوں سے گٹھ جوڑ کر کے اسرائیل میں قادیانی سنٹر قائم کیا اور قادیانیوں نے یہودیوں کے لیے فلسطینی مسلمانوں کی جاسوسی کی۔ان کو بھلا کہاں معلوم ہوگا کہ جس چوہدری ظفر اللہ کی تعریفیں کر رہے ہیں اس نے وزیر خارجہ ہوتے ہوئے بھی بانی پاکستان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی، اس لیے کہ ظفر اللہ خان اپنے عقیدے کے مطابق محمد علی جناح سمیت تمام امت مسلمہ کو کافر سمجھتا تھا۔جس کے نتیجے میں غیر احمدیوں سے نکاح اور ان کی نماز جنازہ پڑھنا حرام ہے۔

پھر چونکہ خواجہ آصف کی مسلم لیگیت قلمی نہیں بلکہ تخمی ہے لہذا ان سے اس طرح کی جہالتوں کا صدور عین فطری ہے۔ ان کے والد خواجہ صفدر نے 1953ء کی تحریک ختم نبوت کی شدید مخالفت کی تھی۔جس کی پاداش میں سیالکوٹ کے عشاقان و مجاہدین ختم نبوت نے ان کا منہ کالا کر کے شہر میں ان کو پھرایا تھا۔(خواجہ صفدر کا منہ کالا کرنے کی تفصیلات درج ذیل کتب میں موجود ہیں۔ ان کہی سیاست: سید مرید حسین، فرد حیات: اے کے خالد، رپورٹ تحقیقاتی عدالت، فسادات پنجاب 1953ء: جسٹس منیر)۔لیکن خواجہ صفدر مرحوم کو تو دور آخر میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کی پہچان ہوگئی تھی اور وہ 1974 کی تحریک میں مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے تھے اور قومی اسمبلی کے ممبر ہوتے ہوئے قادیانی مسئلے پر ہونے والے بحث میں فعال کردار ادا کرتے رہے۔اسی طرح انھوں نے جنرل ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کے چیئر مین کی حیثیت سے 12/اکتوبر 1984ء کو چیچہ وطنی میں ختم نبوت چوک کا افتتاح کیا تھا۔

کچھ کہنے والے اگر چہ یہ بھی کہتے ہیں کہ 1974ء کی تحریک ختم نبوت کی حمایت خواجہ صفدر کی مجبوری تھی۔ مفتی محمود صاحب اسمبلی میں قائد حزب اختلاف تھے اور جمہوری محاذ کے بڑے رہنما۔خواجہ صفدر ان کی زیر قیادت بھٹو کے طوفان سے تحفظ کے لیے جمہوری محاذ میں پناہ لیے ہوئے تھے۔دوسرا آپشن ہی نہیں تھا۔ان کے اصل عقائد و نظریات وہی ہیں جن کا اظہار خواجہ آصف نے کیا ہے۔ بلکہ مسلم لیگ ن کی پوری قیادت کا آج بھی یہی بیانیہ اور عمل ہے، مسلم لیگ کا ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی ہے۔

خواجہ آصف اپنے افکارِ باطلہ کا استدلال جمہوری فکر میں تلاش کرتے ہیں۔ہمیں معلوم ہے کہ جمہوری ضلالت اپنی فطرت میں کفر و ارتداد کی حلیف ہے مگر خواجہ آصف کو بطور خاص ذرا ٹھہر کر سوچنا چاہیے کہ ان کے والد محترم خواجہ صفدر اسّی کی دہائی میں جنرل ضیاء الحق کے خوشہ چیں اور ان کی مارشل لاء حکومت میں شامل (چیئر مین مجلس شوریٰ) تھے۔ بلکہ خود خواجہ آصف پر الزام ہے کہ وہ ملک کے با اختیار طاقتوروں سے رات کی تاریکی میں ملاقاتیں کرنے کے عادی ہیں۔ جمہوریت کے اصولوں سے یہ کس نوعیت کی وفاداری ہے کہ جمہوری طرزِ حکومت کے دشمنِ اعظم آمر جرنیلوں کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے مگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر چھری چلاتے ہوئے ذرا ہچکچاہٹ نہیں ہوتی اور اس سلسلے میں احکامِ الٰہیہ کو ہی بدلنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔

مفتی محمد شعیب

# قربانی......یا......مالی امداد

آج کل معاشی حالات کی وجہ سے ایک سوچ یہ بھی پائی جا رہی ہے کہ'' قربانی دینے کی بجائے غریبوں کی مالی امداد کر دی جائے''۔ لیکن یہ بات کسی طرح بھی درست نہیں۔ آج کل کے حالات میں بھی قربانی ضرور کرنی چاہیے، کیونکہ:

1۔ قربانی ایک مستقل عبادت ہے، جس سے مقصود اللہ کا حکم پورا کرنا ہے، غریبوں کی امداد اس سے براہ راست مقصود نہیں اور عبادات مقرر کرنے یا انھیں تبدیل کرنے کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ علماء کے پاس بھی نہیں ہے۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں دس سال قیام فرمایا اور ہر سال دو خوبصورت مینڈھوں کی قربانی فرمائی، حالانکہ اس زمانے کے معاشی حالات آج کے معاشی حالات کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور تھے، دو وقت کا کھانا بھی آرام سے میسر نہیں تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو اپنے ارشاد اور عمل سے قربانی کرنے کی تعلیم دی ہے۔ قربانی کو غریبوں کی مدد کے ساتھ تبدیل کرنے کی نہ ترغیب دی اور نہ عمل کیا۔

کیا ہم یہ فلسفہ پیش کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے آپ کو غریبوں کا ہمدرد ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

3۔ غریبوں کی مدد کرنا، صدقہ زکوٰۃ اور عطیات دینا شریعت کا علیحدہ حکم ہے، اس حکم کو اپنی جگہ پر رکھتے ہوئے خوب بجالانا چاہیے، مگر ایک حکم کو دوسرے حکم سے تبدیل کرنے کا رجحان بہت خطرناک ہے۔ آج قربانی کو مالی امداد سے تبدیل کرنے کی بات ہے، کل کو حج بھی ختم کرنے کی بات ہونے لگے گی، پھر یہ بھی نقطہ نظر سامنے آئے گا کہ نماز میں اتنا وقت خرچ ہوتا ہے۔ یہ کاروباری سرگرمیوں میں لگا کر لوگوں کے معاشی حالات سنوارنے چاہئیں۔ گمراہی کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔

4۔ کچھ حلقوں سے یہ بات بھی سننے میں آ رہی ہے کہ قربانی بعض اہل علم کے ہاں سنت ہے، لہٰذا موجودہ حالات میں اسے ترک کرنے کی گنجائش ہے۔ بات یہ ہے کہ ان اہل علم کے ہاں قربانی ہر قسم کے حالات میں سنت ہے، چاہے حالات کچھ بھی ہوں، اس لیے یہاں اہل علم کی اس بات کو لینا مقصود نہیں بلکہ اپنی فکر کو بعض اہل علم کی بات کا سہارا دینا یا لبادہ اڑھانا ہے۔

لہٰذا! مسلمان ان باتوں پر کان نہ دھریں اور اپنے قربانی کے مبارک اور باعثِ ثواب عمل کو (حکومتوں کی جانب سے بتائی ہوئی احتیاطی تدابیر کے ساتھ) جاری رکھیں۔ واللہ الموفق

مولانا محمد الیاس بالاکوٹی

# نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض بشری تقاضے اور خصائل

سمجھ لینا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریتِ کاملہ میں جو بشری تقاضے اور آثار وخصائل ہیں، وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی بڑے سے بڑے انسان اور ذی مرتبت شخصیت کے آثار ومظاہر سے کہیں بڑھ کر ہوتے ہیں، مثلاً دیکھیں:

**پسینہ:**

ہر آدمی کو پسینہ آتا ہے اور یہ پسینہ آنا کوئی عیب ونقص نہیں، بلکہ صحت کے لیے ضروری ہے۔ تاہم پسینہ کی کثرت ناگواریِ طبع اور ناپسندیدگی کا باعث ضرور ہوتی ہے، بلکہ بعض افراد کے پسینہ سے جلد ہی بدبو آنا شروع ہو جاتی ہے۔ بہرنوع بدبو نہ بھی آئے تو پسینہ میں کون سی کشش اور دلچسپی کا عنصر ہوتا ہے؟ پسینہ آتے ہی گھٹن اور کوفت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اب ذرا رحمتِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بدنِ اطہر کے پسینے کا تصور فرمائیں، جس پسینے کی مہک سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بآسانی تلاش کر لیتے کہ جس گلی، کوچے، چٹان، درخت کے پاس سے گزر ہوا، معطر ومنور فضائیں پتہ دے رہی ہیں کہ عطر بیز جسد اطہر والے گزرے ہیں۔ حضرت سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی والدہ فرماتی ہیں کہ: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار دوپہر کا قیلولہ میرے ہاں فرماتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پسینہ کثرت سے آتا تھا، دورانِ استراحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آرام میں خلل ڈالے بغیر چپکے سے میں آپ کا پسینہ ایک شیشی میں اکٹھا کر لیتی تھی۔ ایک مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ اکٹھا کر رہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ: کیا کر رہی ہو؟ میں نے عرض کیا: آپ کا پسینہ جمع کر رہی ہوں۔ یہاں عجیب جملہ ارشاد فرمایا: ''نُصْلِحُ بِهَا عُطُوْرَنَا'' کہ ''ہم اس پسینہ مبارک سے اپنے پاس والے عطریات وخوشبویات کی اصلاح کر لیتے ہیں'' یعنی آپ کا پسینہ ہمارے پاس جو خوشبوئیں اور عطر ہیں ان کو اعلیٰ وعمدہ بنا دیتا ہے، گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ خوشبو گر ہے، خوشبو ساز ہے۔ قارئین! آپ نے غور کیا؟ بشری تقاضے اپنی جگہ کہ پسینہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آتا تھا، مگر کسی سے تقابل یا موازنہ ممکن نہیں، فرق وتفاوت بھی سوچ وفکر سے وراء ہے۔

**جسم کے بال:**

عام لوگوں کے جسم کے بال جب تک تناسب سے حدِ اعتدال پہ ہوں تو جسم پہ بھلے لگتے ہیں، مگر جسم سے الگ کرنے کے بعد وہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پہ پھینک دیئے جاتے ہیں۔ سر کے بال، مونچھیں زیادہ بڑھ جائیں تو بدصورتی کے علاوہ میل پکڑ لیتے ہیں، جوئیں بھی پڑ جاتی ہیں، خارش ہونے لگتی ہے، وغیرہ، وغیرہ۔ ذرا سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے

جسدِ اطہر سے اُترے بالوں پر غور کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب حجامت بنواتے تو خود بال اُتارنے والے کی قسمت جاگ اُٹھتی، اپنی سعادت پہ وہ نازاں وفرحاں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہد کی مکھیوں کی طرح اُن پر جھپٹتے، ایک ایک بال کے طلب گار ہوتے، جسے براہِ راست نہ مل سکتا وہ اپنے دیگر ساتھیوں سے لے لیتا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر چونکہ احرام کھولا گیا تھا تو سر منڈانے کے باعث کافی مقدار میں بال تھے، جو خود تقسیم فرمائے۔ روایات میں یہ بھی موجود ہے ایک صحابیہؓ نے حضور کریم رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے چند بال مبارک ایک نلکی میں محفوظ کر رکھے تھے۔ جہاں کسی بچے کی آنکھ دکھنے لگتی، پھنسی نکل آتی یا کوئی عارضہ لاحق ہوتا تو متعلقہ حضرات بڑی اماں کے پاس جا کر عرضِ احوال کرتے۔ اماں جی پانی کا گھونٹ لے کر اس نلکی میں ڈال کر ہلاتیں اور وہ محلول سائل کو دے دیتیں، وہ جام صحت بچے کی آنکھ پر مل لیا جاتا یا پانی پلا دیا جاتا۔ سبحان اللہ! مشہور واقعہ ہے جس کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جاسکتی کہ حضرت سیدنا معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما نے ایک صحابی سے جن کے پاس آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد بال مبارک تھے، بڑی لجاجت ومنت سماجت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند بال عطا کرنے کی درخواست کی اور جب صحابی رضی اللہ عنہ نے تمنا وچاہت پوری کردی اور بال مبارک عطیہ کر دیئے تو وہ ان کے بڑے مرہون منت ہوئے اور بہت سا مال وزر اُن کی نذر کیا۔ حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے وقت وصال سے قبل اپنے لواحقین کو یہ وصیت فرمائی کہ میری میت کی تجہیز وتکفین کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک میری میت کی آنکھوں میں رکھ دیئے جائیں اور پھر مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سپرد کر دیا جائے۔ قارئین! یہاں بھی بشریتِ رسول کا تقاضا اور اس کے آثار کاظہور اپنی جگہ، مگر موازنہ یا مماثلت کا دعویٰ کیوں کر کیا جاسکے گا؟

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

## حشرات کے بارے میں:

مکھی مچھر وغیرہ ہر جسم پہ بیٹھتے ہیں، یہ کسی کے لیے پسندیدہ اور خوش کن صورت حال نہیں ہوتی، بلکہ آدمی ان موذی چیزوں سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ گندگی سے پیدا ہونے والے جانور ہیں اور قابل نفور بھی ہیں۔ رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر وطیب پر کبھی بھی مکھی نہیں بیٹھی اور نہ ہی جسدِ اطہر سے ٹکرائی، نہ ہی آپ کے اوپر سے گزری، نہ ہی آپ کو کبھی مچھر نے کاٹا۔ البتہ بچھو کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ بچھو نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں پہ کاٹنے کی کوشش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں اپنی نعلین مبارک سے اسے کچل دیا اور یہ ارشاد بھی فرمایا: ''یہ عقرب (بچھو) لعنتی جانور ہے، یہ انبیاء پر بھی حملہ کرنے سے نہیں ٹلتا۔'' قارئین: آپ نے دیکھا! یہاں بھی یہ انفرادیت صرف اور صرف جسدِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی حاصل ہے، کوئی اور آپ کا شریک نہیں۔

## قد کاٹھ:

انسانی قد کاٹھ کی بھی یکسانیت نہیں ہوتی، کوئی بلند قامت تو کوئی پست قد، کوئی نہایت لاغر واکہرے بدن کے،

تو کوئی اچھے خاصے متبدّ ن (بھاری جسم والے) ہوتے ہیں، یہاں تک کہ حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم میں حضرت سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ دراز قد اور وجیہ تھے، جبکہ حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قد مبارک اونچا نہیں تھا۔ حضرت سرورکونین صلی اللہ علیہ وسلم کا قد مبارک نہ لمبا تھا، نہ ٹھگنا اور نہ ہی اکہرا، نہ چوڑا چکلا (ظاہر ہے جس ذات کی تراش وخراش ، تزئین وتحسین خود خلاقِ کائنات نے براہِ راست اپنے طور پر فرمائی، اس کا ثانی ہونا ممکن نہیں) یہاں پر تفصیل بیان نہیں کی جاسکتی، یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جب حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مصاحبین اور فدا کاروں میں محوِ سفر ہوتے یا جلوہ افروز ہوتے تو سب سے اونچے اور بلند نظر آتے، حالانکہ بلند قامتی نہ تھی، مگر خلاقِ عالم نے ''وَرَفَعْنَا لَکَ'' کا جلوہ یہاں بھی قائم رکھا ہوا تھا، یعنی رفعت اور بلندی قد کاٹھ کی نہ تھی، شان وآن کی تھی۔ قد مبارک متوازن وحسین تھا: ''اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ'' سفر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اونچے نظر آتے تھے اور ہم رکاب صحابہؓ سے نکلا ہوا بلند وبالا اور واضح جسم صرف آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ہوتا تھا۔

## ماءِ مستعمل:

انسانی بدن ناپاک گرچہ نہ بھی ہو، پھر بھی اس سے ٹپکتا گرتا پانی اصطلاحِ فقہ میں ماءِ مستعمل کہلاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ یہ طاہر غیر مطہر ہے، یہ پانی ناپاک یا حرام نہیں کہلائے گا، مگر استعمال شدہ پانی سے آئندہ نہ غسل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی وضو کیا جاسکتا ہے اور نہ کھانا پکانے، آٹا گوندھنے میں استعمال درست ہے، ہاں! ناپاک کپڑا اس سے پاک ہو جائے گا پیا جاسکتا ہے، زمین پر گرا ہو تو اُس پر نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(نوٹ: حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مستعمل پانی ناپاک ہے، کیونکہ اس میں گناہوں کی نجاست شامل ہو جاتی ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ایسے ہی وارد ہے، مگر دیگر اکابرِ اُمت کی رائے وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ بہرحال یہ بات آپ کے علم میں آگئی کہ استعمال شدہ پانی ایک گونہ ناپسندیدہ شئے ہے، ناقص ضرور ہے، اعلیٰ نہیں۔)

حدیبیہ کے میدان میں مشرکینِ مکہ نے محمدی قافلہ کو عمرہ کی ادائیگی سے روک دیا تھا۔ یہ داستانِ فدائیت اپنی جگہ اہلِ ایمان کے ایقان کو پختہ اور توانا کرنے والی تواریخ اسلام کا حصہ ہے۔ طائف کے بنوثقیف کے رئیس وسردار مسعود ثقفی نامی قریش کی طرف سے سفیر بن کر آئے ہوئے تھے، جہاں وہ مصالحتی کردار ادا کررہے تھے، وہاں یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ محمدی رضا کاروں، جانثاروں کی کیا کیفیت ہے اور وہ کس حد تک جاسکتے ہیں، ان میں کتنا دم خم ہے؟! یہ صاحب جب مکہ مکرمہ واپس گئے تو قریش مکہ کے سامنے انہوں نے جو منظر دیکھا تھا، اس کی منظر کشی کچھ اس طرح کی:

''میں بڑے بڑے رؤسا، امراء اور شاہی درباروں میں گیا ہوں اور ان کے حاضر باش درباریوں کے آداب، رکھ رکھاؤ اور ٹھاٹھ باٹھ بھی اچھی طرح دیکھے ہیں، ان کے جذبوں اور اظہارِ محبت والفت کے انداز بھی ملاحظہ کیے ہیں، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے جاں نثاروں کی جو صورت حال میں نے دیکھی ہے وہ نرالی ہے، نہایت محیر العقول ہے۔ محمد صلی

اللہ علیہ وسلم جب لعاب پھینکتے ہیں تو وہ لوگ اسے زمین پہ نہیں گرنے دیتے، بلکہ ہاتھوں پہ لے لیتے ہیں، اپنے منہ اور جسم پہ مل لیتے ہیں، جب وہ وضو کرتے ہیں تو پانی اپنے ہاتھوں پہ لے لیتے ہیں۔ اور ہجوم کے باعث حاضرین میں سے جسے وہ پانی نہ مل سکے تو وہ دوسرے ساتھی سے تھوڑی سی نمی لے کر اپنے اوپر مل لیتا ہے۔‘‘

غور کیجئے! یہ شخص اس وقت ایمان نہیں لایا ہوا تھا اور دشمن کیمپ کا نمائندہ بن کر آیا ہوا تھا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حسن عقیدت ووارفتگی اور دل بستگی کی روح پرور روئیداد کی منظر کشی کس بے ساختگی سے کر رہا ہے، گویا کہ اس نے قریش مکہ کو اپنے طور پر یہ حقیقت بتلا دی کہ جس شخص کے اردگرد ایسے لوگ موجود ہوں کہ اس کے استعمال شدہ پانی اور لعاب کو ضائع نہیں ہونے دیتے، بھلا وہ لوگ ان کی ذات پر کوئی آنچ آنے دیں گے؟ قارئین! یہ صرف ایک واقعہ بطور استشہاد ذکر کیا گیا، ورنہ دیگر کتنے استدلال پیش کیے جاسکتے ہیں، یہاں بھی موازنہ یا مطابقت کیسے متصور ہوسکتی ہے؟ ’’تو کجا مَن کجا‘‘

نیند:

ویسے نیند انسانوں کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے اور انسانی ضروریات میں سے ایک اہم عنصر ہے۔ تاہم ایک غفلت، بے خبری، ایک گونہ بے بسی کا ظہور نیند سے سامنے آتا ہے۔ نیند میں آدمی اپنے آپ سے اپنے ماحول سے کٹ جاتا ہے، حالانکہ وہیں موجود ہوتا ہے۔ آج کے ہیجان خیز ماحول نے بعض لوگوں کو بے خوابی کا مریض بنا ڈالا ہے، چنانچہ وہ نیند لانے کے لیے خواب آور ادویہ استعمال کرتے ہیں، نیند نہ آتی ہو تو دیگر کئی قسم کے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، تاکہ نیند آئے اور جسم کو سکون میسر ہو۔

انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی نیند عام انسانوں کے برعکس خدا تعالیٰ کے برگزیدہ ترین صالحین اور کاملین کی مقبول عبادت کے لمحات سے بھی کہیں بہتر ہوتی ہے، دیکھئے! حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا خواب ہی تو تھا جس کی بنا پر انہوں نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا عظیم اقدام کیا اور مقبولیت کا مقام پا گئے، جبکہ اسلام میں فریضۂ حج میں مقام منیٰ کے سب اعمال، قربانی، رمیِ جمار، وغیرہ انہی کی سنت ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے: ’’وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ‘‘ یعنی ہم نے ان کی اس قربانی کے عظیم عمل کو آنے والی نسلوں کے لیے جاری کر دیا۔ ظاہر ہے خواب کا تعلق نیند سے ہے اور یہ اس کی ہی فرع ہے، نیز معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی نیند میں دیکھی گئی چیز بھی وحیِ الٰہی کہلاتی ہے اور احکام شریعت کا حصہ بنتی ہے، بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ وحی شروع ہونے سے قبل رؤیائے صالحہ کا سلسلہ جاری ہوا تھا۔ ارشاد فرمایا: جو اس وقت خواب میں دکھایا جاتا نصف النہار کی طرح اس کا ظہور ہوتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے: ’’تَنَامُ عَيْنَايَ وَلَا يَنَامُ قَلْبِيْ أَوْ كَمَا قَالَ‘‘ یعنی میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔ یہی وجہ ہے کہ سونے سے ہر آدمی کا وضو جاتا رہتا ہے، مگر انبیاء کرام علیہم السلام کا وضو قائم رہتا تھا۔ قارئین کرام! آپ نے مذکورہ

معروضات سے بخوبی اندازہ کرلیا ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ سب انبیاء کرام علیہم السلام اور دیگر اُمتیوں کی نینداور خوابوں میں کتنا تفاوت اور عظیم فرق ہے۔

خون:

خون جسدِ انسانی کا ایک ناگزیر حصہ ہے اور ہر جسم میں خون لازماً ہوتا ہے اور کسی نہ کسی شکل میں اس کا خروج بھی ہو ہی جاتا ہے۔ خون جسم انسانی کی بقاء وصحت کا ضامن ہے، مگر خون خواہ انسان کا ہو یا جانور کا، پھر جانور خواہ حلال ہو یا حرام، خون بہر حال ناپاک بھی ہے اور حرام بھی۔ بدن کپڑے یا زمین جس جگہ جہاں لگ جائے وہ نجس کہلائے گی، اسے پاک کرنے کے لیے دھونا یا دور کرنا ضروری ہوگا۔

جسدِ اقدس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجامہ کروایا، بدنِ اقدس سے نکلا ہوا لہو ایک برتن میں پڑا تھا، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما آئے تو حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا: عبداللہ! یہ خون لے جاؤ، کہیں دبادو۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما وہ پیالہ اُٹھا کر لے گئے۔ اب ضمیر کی خلش نے عجیب مخمصے میں ڈال دیا کہ مفخر موجودات، سیدالاولین والآخرین کے جسدِ اطہر واطیب، ارفع اعلیٰ سے نکلا ہوا یہ خون ہو اور یہ نعمت بے بہا میسر بھی ہو، میں اُسے پھینک دوں؟ دبادوں؟ ضائع کردوں؟ دماغ یہ وزن نہ اُٹھا سکا، احساسات قلبی کے ہاتھوں مجبور ہوکر انہوں نے چپکے سے وہ پی لیا۔ جی ہاں! اپنے من کا یہ فیصلہ ان کو صحیح محسوس ہوا اور پھر خاموشی سے لاکر برتن رکھ دیا۔ حضور اکرم رحمت مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کے چہرہ پر نگاہ ڈالی جو اُن کی اندرونی کیفیت اور بشاشت کا پتہ دے رہا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: پھینک آئے؟ سر ہلا کر عرض کی: جی چھپا، دبا آیا۔ حضور کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَعَلَّکَ شَرِبتَ'' یعنی شاید تو نے پی لیا''...... یہاں انکار یا تاویل کی گنجائش نہ تھی اور نہ کوئی معذرت کی ضرورت۔ سبحان اللہ! اس پر ارشاد نبوی کا حاصل کچھ اس طرح ہے کہ تمہارے دشمنوں کے لیے بربادی وہلاکت ہے۔ گویا کہ فرمان یہ تھا کہ: میرے جسم سے کشید کردہ خون جس جسم کا حصہ بن گیا اس جسم کے کیا کہنے! اس کی جرأت وبسالت، ہمت وحوصلے کے کیا کہنے! اس شخص سے ٹکرانے والے کی بدقسمتی پر بھی تف ہے، اس کی شامت آئے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس حرکت پر تنبیہ نہیں کی، ٹوکا نہیں کہ یہ کیا حرکت ہے؟! تم نے پی کیوں لیا؟ چہرۂ انور پر کوئی ناگواری کا اثر بھی ظاہر نہیں ہوا۔ قارئین کرام! یہاں بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ بتقاضائے بشریت بطورِ علاج خون نکلوایا گیا، یہ بات بس یہاں تک محدود رہے گی، آگے خون کے احکامات یا موازنہ یا تقابل یا کچھ مزید کہنا تو یہ بے ادبی اور گستاخی کے زمرے میں آئے گا اعاذنا اللہ منھا۔

(نوٹ: سطور بالا اور گزشتہ معروضات سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ جسدِ اطہر سے نکلی دیگر رطوبات بھی اسی نسبت سے اعلیٰ وارفع ہوں گی اور یہ تفاوت مبنی برحقیقت ہوگا، مجاز یا صرف حسنِ عقیدت ومحبت ہی نہ ہوگا۔)

**فضلہ جات:**

آدمی جو خوراک کھاتا ہے اس کا کچھ حصہ جزوِ بدن بن جاتا ہے، باقی اس کا فضلہ بنتا ہے اور وہ اپنے فطری طریقے سے خارج ہوتا ہے، جسے ہم پیشاب پاخانہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا خروج بھی ناگزیر اور امورِ طبعیہ سے ہے، یہ سلسلہ زندگی کا لازمہ ہونے کے باوجود دلچسپی یا دل بستگی کا عنوان نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کسی خوبی وکمال یا مقام مدح بنتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہ تقاضائے بشریت یہ عمل بھی جسدِ محمدی سے صادر ہونا تھا، سو ہوا۔ آخر اُمت کے لیے اس میں بھی ہدایت ور اہنمائی چاہیے تھی۔ بعض اُمورامت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے پیدا کر کے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر کروائے، تاکہ ان کی اُمت کے لیے راہنمائی کا سامان ہوسکے۔ ایک یہودی نے ایک صحابیؓ کو بطور طعن کہا: تمہارے نبی نے تو تمہیں پیشاب کرنے کے بھی آداب سکھائے ہیں؟! اس پر صحابیؓ نے مرعوب ہونے کی بجائے پورے شرح صدر سے جواب دیا: ہاں! میرے نبی نے ہمیں بتلایا کہ روبقبلہ ہوکر پیشاب مت کرو، نیچی جگہ سے اونچی طرف نہ کرو، پیشاب سے بچو، وغیرہ۔

**قضائے حاجت:**

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قضائے حاجت کے لیے جاتے تو بہت دور تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ بعض مرتبہ نظروں سے اوجھل ہوجاتے۔ ویسے بھی ضرورت ہی کم پڑتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قضائے حاجت سے فراغت کے بعد کوئی اثر یا نشان نہیں پایا گیا۔ ایک سفر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قضاء حاجت کی ضرورت تھی، وہاں آس پاس کوئی اوٹ یا ٹیلا نہ تھا۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافی فاصلے پر ایک درخت کو اشارہ کیا، درخت تعمیل ارشاد میں حاضر ہوگیا، پھر دوسرے درخت کو بلایا اور دونوں کی اوٹ میں فراغت کی، پھر ان دونوں درختوں کو واپس اپنی اپنی جگہ پر چلے جانے کا حکم ہوا اور وہ چلے گئے۔

قارئین باتمکین! سطور بالا میں مذکور بعض ان اعراض کا ذکر ہوا جو جسدِ نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام سے صادر ہوئے اور یہ معروضات جسدِ نبوی سے خارج شدہ ناقص، انقص اور ادنیٰ سے ادنیٰ کے احوال تھے۔ سوچیں! ناقص کا یہ عالم ہے تو اعلیٰ وارفع کی بالاتری کا عالم کیا ہوگا؟! قلم ایں جارسید وسر بشکست

**اللھم صل وسلم علیٰ نبیک وعلیٰ آلہٖ واصحابہ اجمعین**

**محمد بشر ولیس کالبشر**

**ھوفی الناس کالیا قوت فی الحجر**

(مطبوعہ: ماہنامہ ''بینات'' دسمبر ۲۰۱۹ء)

حضرت علامہ محمد عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ

# حضرات عشرہ مُبشرہ رضی اللہ عنہم

۱۔سیدنا ابوبکر صدیق ۲۔سیدنا عمر بن الخطاب ۳۔سیدنا عثمان بن عفان ۴۔سیدنا علی المرتضیٰ ۵۔سیدنا طلحہ ۶۔سیدنا زبیر ۷۔سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف ۸۔سعد بن ابی وقاص ۹۔سیدنا ابوعبیدۃ بن الجراح ۱۰۔سیدنا سعید بن زید رضی اللہ عنہم اجمعین

امام ابن عبدالبر ایک جگہ چند صحابہ کرام کے اسماء گرامی لکھ کر فرماتے ہیں: **وفضائلهم لا يحيط بها كتاب (الاستيعاب ص ۳۲۷)** ان حضرات کے کے فضائل تو ایک کتاب میں بھی نہیں آسکتے۔یہی گزارش ہم کرتے ہیں کہ حضرات خلفاء راشدین، خاتون جنت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا اور سید اشباب اہل الجنۃ حسن وحسین رضی اللہ عنہم کے حالات ایک تو لکھے پڑھے لوگوں کو کچھ معلوم ہی ہیں، دوسرے اگر ان حضرات پر کچھ لکھنا شروع کریں تو بے ساختہ بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے، اور یوں ایک غیر معمولی ضخامت کی کتاب مرتب ہوجائے گی، جو من وجوہ ہماری وسعت سے باہر ہے۔ اس لیے ہم ان حضرات کے تذکرے سے سکوت اختیار کرتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔ رضی الله عنهم وارضاهم

**سیدنا طلحہؓ**

دشمنان اسلام کی ایک سازش......اور بہت بڑی سازش......اپنا کام کرگئی۔امت مسلمہ کے ایک نزاعی مسئلہ نے خطرناک خانہ جنگی کی صورت اختیار کرلی۔وہ تلوار جو پہلے کفر کی شہ رگ کاٹ رہی تھی آج مسلمانوں کی گردنوں پر چل رہی تھی۔تھوڑے سے وقت میں کشتوں کے پشتے لگ گئے۔جمل کے روز جانبین سے ہزاروں مسلمان کھیت رہے۔جنگ کا بادل چھٹا تو خلیفۂ راشد سیدنا علی المرتضیٰ نے اعلان فرمایا کہ کسی مسلمان کی کوئی چیز مال غنیمت سمجھ کر نہ لی جائے۔طرفین کے مقتولین کو جمع کر کے ان کے جنازے پڑھے جائیں گے اور انہیں باقاعدہ دفن کیا جائے گا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ چلتے چلتے ایک لاش کے پاس آ کر رک گئے، کچھ دیکھا، کچھ سوچا اور پھر میت کا ایک ہاتھ (جو مدت ہوئی شل ہوچکا تھا اور اب محض ایک لوتھڑے کی شکل میں بدن کا حصہ تھا) اسے اٹھا کر بوسہ دیا، اناللہ پڑھا اور بے ساختہ آنسوؤں کے چند قطرے ڈھلک پڑے۔یہ نعش کس کی تھی؟ سیدنا طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی، جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے۔

| | | |
|---|---|---|
| ا۔ | طَلحَة فِی الجَنَّة | طلحہ بہشت میں جائیں گے |
| ب۔ | طَلحَةُ وَالزُّبَیر جَارَایَ فِی الجَنَّة | طلحہ اور زبیر بہشت میں میرے ہمسائے ہوں گے |

ج. مَن سَرَّہ اَن یَنظُرَ اِلٰی شَہِید یَمشِی عَلی وَجہِ الاَرضِ فَلیَنظُر اِلیٰ طَلحَۃ بنِ عُبَیدِاللّٰہ
جس شخص کو یہ بات اچھی لگتی ہو کہ وہ زمین پر چلتے پھرتے شہید کو دیکھے،تو وہ طلحہ بن عبید اللہ کو دیکھ لے۔حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ شل کیونکر ہوا تھا؟ آیئے اس کا پس منظر مختصراً سنیے۔

شوال ۳ھ کا مہینہ ہے۔مدینہ منورہ کے شمال میں کوہ احد کے دامن میں ایمان والوں اور مشرکین کے درمیان گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے۔مشرکین مکہ کا لشکر کیل کانٹے سے لیس اور تعداد میں مسلمانوں سے چار پانچ گنا ہے۔مسلمانوں کے پاس نہ افرادی قوت ہے،نہ جنگی ساز وسامان،البتہ دلوں میں ایمانی جذبات موجزن ہیں اور توکل علی اللہ ان کا سرو سامان۔پہلے ریلے میں کافروں کے پاؤں اکھڑ گئے،فتح مسلمانوں کے قدم چومتی ہے۔ناگاہ مسلمانوں سے ایک لغزش سرزد ہو جاتی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس تیراندازوں کو ایک درے پر تعینات فرمایا تھا۔فتح کے آثار دیکھ کر ان میں سے چالیس افراد نیچے اتر آئے۔کفار کو موقعہ مل گیا،انہوں نے پیچھے لوٹ کر حملہ بول دیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ پانسہ پلٹ گیا۔فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ادھر یہ مشہور ہو گیا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں صحابہ رضی اللہ عنہم،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میدان میں چھوڑ کر چلے گئے۔صرف چند حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد وپیش رہ گئے،بعد میں دوسرے لوگ بھی لوٹ آئے۔اس موقعہ پر جن حضرات نے خصوصیت سے فدائیت کا مظاہرہ کیا اور داد شجاعت دی،ان میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ،امتیازی شان کے مالک ہیں۔

آپ کا نام طلحہ،والد کا نام عبید اللہ،کنیت ابو محمد اور عرف طلحہ الخیر ہے۔قبیلہ قریش کے معزز خانوادہ سے تعلق ہے۔اسلام قبول کرنے سے پہلے تجارت کرتے تھے،بعد میں بھی اسی پیشے سے تعلق رہا۔آپ کے اسلام قبول کرنے کا عجیب واقعہ ہے،جو خود ان کی زبانی کتابوں میں منقول ہے۔بیان کرتے ہیں:

میں بُصری کے میلے میں گیا،وہاں گرجا گھر کے ایک پادری نے لوگوں سے کہا کہ دریافت کرو،یہاں کوئی شخص مکہ سے آیا ہوا ہے۔پوچھنے پر میں نے کہا،ہاں میں ہوں۔مجھے اس کے پاس لے گئے تو اس نے پوچھا: کیا تمہارے عبدالمطلب کے پوتے،عبداللہ کے بیٹے،احمد کا ظہور ہو چکا ہے؟ یہی مہینہ ہے جس میں اس کا ظہور ہونا ہے،وہ اللہ کے آخری نبی ہوں گے۔ان کا ظہور مکہ میں ہوگا اور پھر ایسے شہر کو ہجرت کریں گے جہاں کھجور کے درخت ہوں گے۔اس کی زمین پتھریلی یا شور زدہ ہوگی۔یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔میں جلدی سے مکہ واپس آ گیا اور آتے ہی میں نے پوچھا: کوئی نئی بات پیش آئی ہے؟ لوگوں نے بتایا،ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور ابوقحافہ کا بیٹا (ابوبکر) اس کے پیچھے لگ گیا ہے۔میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاں چلا گیا اور پھر ان کے ہمراہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر میں نے اسلام قبول کر لیا۔میں نے پادری کا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سنایا (اصابہ)۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اسلام نے قبول کیا تو مشرکین مکہ کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔اگرچہ انہوں نے ظلم

ڈھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر آپ کا ایک ہی جواب ہوتا۔

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

ہجرت کے بعد ان کا شمار قریبی جاں نثاروں میں ہوتا تھا۔ جنگ احد میں جب کافروں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نرغے میں لینا چاہا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تیروں کی بوچھاڑ کر دی تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سینہ سپر ہو کر آگے کھڑے ہو گئے۔ دشمن کی جانب سے آنے والے ہر تیر کو اپنے ہاتھ سے (۱) روکتے تا کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچنے پائے۔ پھر کیا تھا؟ تیروں کو روکتے روکتے ہاتھ لہولہان ہو گیا اور بالآخر ہمیشہ کے لیے شل ہو کر رہ گیا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ اس روز تلواروں، نیزوں اور تیروں کے پچھتر زخم آپ کے بدن پر آئے تھے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات کا یہ بھی ایک لطیفہ (امتیاز) ہے کہ انہوں نے چار شادیاں کی تھیں اور چاروں کے لحاظ سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم زلف (ساڑھو) تھے۔ جدول ذیل میں دیکھیے۔

| حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی بیویوں کے نام | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے نام |
|---|---|
| (۱) حضرت ام کلثوم بنت سیدنا ابی بکر رضی اللہ عنہما | ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا |
| (۲) حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا | ام المومنین سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا |
| (۳) حضرت بارعہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہما | ام المومنین سیدہ ام حبیبہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہما |
| (۴) حضرت رقیہ بنت ابی امیہ رضی اللہ عنہا | ام المومنین سیدہ ام سلمہ بنت ابی امیہ رضی اللہ عنہا |

## حواشی

(۱) اس روز جن حضرات نے خصوصیت سے بے جگری اور پامردی کا ثبوت دیا تھا ان میں سے ایک حضرت ابودجانہ انصاری رضی اللہ عنہ ہیں۔ بات سن کر آگے نکل جانا بڑا آسان ہے۔ ذرا ٹھہر کر سوچئے تو اس وقت کیا عالم ہوگا، جب کہ دشمن تیروں کی بارش کر رہا ہے اور انصاری سورما، ابودجانہ رضی اللہ عنہ کبڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھکے ہوئے ہیں۔ تیروں سے پیٹھ چھلنی ہو رہی ہے، لیکن کیا مجال کہ زبان سے اف تک نکل جائے۔ دل میں ایک لگن ہے عشق ہے محبت ہے اور بزبان حال کہہ رہے ہیں۔

موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے ہم اٹھ جائیں کیا؟

جن لوگوں کے بدن میں اللہ کے دین کی خاطر کبھی ایک پھانسی تک نہیں چبھی، وہ کیا جانیں قدر ومنزلت ایسے جاں نثاروں کی؟ اچھا اور کوئی جانے نہ جانے، اللہ علیم وخبیر تو خوب جانتا ہے اور وہ اجر دینا بھی جانتا ہے۔

کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

☆......☆......☆

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

# زبان کی آفتیں

انسان جتنے کام یا کلام کرتا ہے بظاہر اس کی تین قسمیں ہیں:

1۔مفید: جس میں کوئی دین یا دنیا کا فائدہ ہو۔

2۔مضر: جس میں دین یا دنیا کوئی نقصان ہو۔

3۔نہ مفید نہ مضر: جس میں نہ کوئی فائدہ ہو نہ نقصان۔

اس تیسری قسم کو حدیث میں لایعنی کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے لیکن جب ذرا غور سے کام لیا جاوے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تیسری قسم بھی درحقیقت دوسری قسم یعنی مضر میں داخل ہے۔

**گالی گلوچ کرنا:** گالی اور فحش کلامی سے مراد یہ ہے کہ ایسے کام جن کے اظہار سے آدمی شرماتا ہو، ان کو صریح اور کھلے الفاظ سے ظاہر کرنا۔ پھر اگر وہ واقع کے مطابق اور صحیح ہو تو ایک گناہ گالی دینے کا ہے اور اگر واقعہ کے خلاف ہو تو دوسرا گناہ بہتان وافترا کا بھی ہے۔ جیسے کسی شخص یا اس کی ماں، بہن کی طرف کسی فعلِ حرام کی نسبت کرنا۔

حدیث شریف میں ہے کہ:

''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے''۔ (بخاری ومسلم)

**لعنت کرنا:** لعنت کے معنی ہیں کسی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور یا غضب وقہر میں مبتلا یا دوزخی کہنا یا بطور بددعا کے یہ کہنا کہ اس کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دور کر دے یا اس پر غضب الٰہی نازل ہو یا دوزخ میں جائے وغیرہ۔

**لعنت کے تین درجے ہیں:**

1۔ ایک جن اعمال وخصائل پر قرآن مجید وحدیث میں لعنت وارد ہوئی ہے، ان اوصاف عام کے ساتھ لعنت کرنا، جیسے: ''لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَافِرِیْنَ یا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظَّالِمِیْنَ ''۔ یہ صورت بالاتفاق جائز ہے۔

2۔ دوسرے کسی مخصوص فرقۂ ضالہ پر اس کے وصفِ ضلالت کے ساتھ لعنت کرنا۔ مثلاً یہ کہنا کہ یہود ونصاریٰ پر لعنت یا روافض وخوارج پر لعنت یا سود خوروں، شرابیوں وغیرہ پر لعنت جس میں کسی شخص یا جماعت کی تعیینِ خاص نہیں ہے، یہ صورت بھی جائز ہے۔

3۔ تیسری صورت یہ ہے کہ کسی خاص شخص زید وعمرو پر یا کسی جماعتِ خالص مثلاً فلاں شہر کے رہنے والے یا فلاں قبیلے کے لوگ یا فلاں پیشہ والے یا فلاں قوم پر لعنت، یہ سخت خطرناک معاملہ ہے، اس میں بڑی احتیاط لازم ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ:

''جس شخص پر لعنت کی جاتی ہے، اگر وہ لعنت کا مستحق نہیں ہوتا تو وہ لعنت اس کے کہنے والے پر لوٹتی ہے۔'' اور فرمایا کہ: ''مؤمن پر لعنت کرنا ایسا گناہ ہے جیسے اس کو قتل کر دیا۔'' (بخاری ومسلم)

لعنت کرنا جیسے کسی مسلمان پر جائز نہیں کسی جانور اور معین کافر پر بھی جائز نہیں۔

**دل لگی وتمسخر کرنا:** تمسخر کے معنی یہ ہیں کہ کسی کی اہانت وتحقیر اور اس کے عیب کا اظہار اس طرح کیا جائے جس سے لوگ ہنسیں یا دل لگی کرنا جس سے دوسرے کو ایذا پہنچے۔ اس میں بہت سی صورتیں داخل ہیں، مثلاً:

1۔ کسی کے چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، بولنے ہنسنے وغیرہ کی نقل اتارنا یا قد وقامت، شکل وصورت کی نقل اتارنا۔

2۔ اس کے کسی قول وفعل پر ہنسنا۔

3۔ آنکھ یا ہاتھ پیر کے اشارہ سے اس کے عیب کا اظہار کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو لوگ دوسرے لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں، آخرت میں ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولا جائے اور اس کی طرف بلایا جائے گا، جب وہ سر کتا سسکتا ہوا وہاں تک پہنچے گا تو بند کر دیا جائے گا، اسی طرح برابر جنت کے دروازے کھولے اور بند کیے جائیں گے، یہاں تک کہ وہ مایوس ہو جائے اور بلانے پر دروازہ جنت کی طرف نہ جائے گا''۔

بعض لوگ ناواقفیت یا غفلت سے تمسخر کو مزاح (خوش طبعی) میں داخل سمجھ کر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مزاحِ جائز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اس کی شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی بات خلافِ واقعہ زبان سے نہ نکلے اور کسی کی دل آزاری نہ ہو اور وہ بھی مشغلہ اور عادت نہ بنے، کبھی کبھی اتفاقاً ہو جائے اور جس تمسخر میں مخاطب کی دل آزاری یقینی ہے وہ باجماع حرام ہے اس کو مزاحِ جائز میں داخل سمجھنا گناہ بھی ہے اور جہالت بھی۔

**چغل خوری:** کسی کا عیب یا ایسا قول وفعل جس کو وہ چھپانا چاہتا ہے، دوسروں پر ظاہر کرنا چغلی ہے۔ چغلی کھانا گناہ کبیرہ ہے۔ پھر اگر وہ عیب واقعی اور صحیح بات ہے تو صرف چغلی کا گناہ ہوگا اور اگر واقعہ کے خلاف ہے یا اپنی طرف سے اس میں کچھ کمی یا زیادتی کی یا برے عنوان، برے طرز سے نقل کیا تو افترا و بہتان بھی ہے جو مستقل کبیرہ گناہ ہے اور جس کی طرف سے چغلی کی گئی ہے اگر اس کے کسی عیب کا اظہار ہے تو غیبت بھی ہے جو تیسرا گناہِ کبیرہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''جو چغلی لے کر ادھر سے ادھر جاتے ہیں پھر دوستوں میں باہم فساد ڈلواتے ہیں اور جو بے قصوروں کے عیب ڈھونڈتے ہیں، بدترین انسان ہیں۔'' اور فرمایا: ''چغل خور جنت میں نہیں جائے گا، چغلی عذابِ قبر ہے۔'' (بخاری)

**کذب (جھوٹ):** (خلاف واقعہ بات کہنا کذب ہے)، بے تحقیق کسی بات کا نقل کرنا اور سنی سنائی بات کو بدوں تحقیق

کے فوراً زبان سے نکال دینا بھی گناہ ہے۔ (انفاس عیسی :185)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جھوٹ بولنے سے بچو کہ جھوٹ اور فجور ساتھ ساتھ ہیں اور یہ دونوں جہنم میں ہیں۔'' اور فرمایا: ''جھوٹی شہادت تین مرتبہ شرک کے برابر ہے۔'' (نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد وترمذی)

**غیبت:** کسی کے پیٹھ پیچھے اس کی ایسی بات کہنا کہ اگر وہ سنے تو اس کو ناگوار ہو، اگر چہ وہ بات اس کے اندر موجود ہی ہو اور اگر وہ بات اس میں نہیں تو وہ غیبت سے بڑھ کر بہتان ہے۔ اسی طرح کسی کی نقل اتارنے سے مثلاً آنکھ دبا کر دیکھنا، لنگڑا کر چلنا بھی (غیبت ہے) بلکہ یہ زیادہ برا ہے۔

غیبت کا مذموم ہونا (قرآن اور حدیث سے) ظاہر ہے، اس کی مضرت دین ودنیا میں ہے۔ دنیا کی مضرت تو یہ ہے کہ اس سے باہمی تشویش و نااتفاقی ہوتی ہے، آپس میں فساد ہو جاتا ہے اور دین کی مضرت یہ ہے کہ قیامت کے دن غیبت کرنے والے کی نیکیاں اس کو مل جائیں گی، جس کی غیبت کی تھی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ غیبت حق العبد ہے، جب وہ معاف کرے گا تب معاف ہوگا۔

**مدح سرائی:** حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مجمع میں اپنے دوست کی تعریف کی تو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹ دی۔'' مطلب یہ ہے کہ اس کے نفس میں خود پسندی و بڑائی پیدا کر کے اس کو ہلاک کر دیا۔ دوم اپنی تعریف سن کر نفس پھولتا ہے اور اعمالِ خیر میں سست پڑ جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ''مسلمان بھائی کو کند چھری سے ذبح کر دینا اس سے بہتر ہے کہ اس کہ منہ پر اس کی تعریف کی جائے''۔ اس لیے کہ ممدوح مغرور ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کو قابلِ تعریف سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ یہ اس کی ہلاکت وتباہی کی جڑ ہے۔

**طریقِ کار:** حدیث شریف میں ہے کہ: ''جب صبح ہوتی ہے تو تمام اعضائے بدن زبان سے خوشامد کر کے کہتے ہیں کہ تو ٹھیک رہنا، اگر تو ٹھیک رہی تو ہم بھی درست رہیں گے اور اگر تو بگڑی تو ہم سب بگڑ جائیں گے''۔ (لہٰذا لازم ہے کہ ہر ممکن طریق سے زبان کی حفاظت کریں اور ان باتوں کی سختی سے پابندی کریں۔)

بولنے میں احتیاط رکھیں (بدوں سوچے کوئی بات نہ کیا کریں) اگر کبھی کوئی بات خلاف شریعت ہو جائے تو فوراً خوب توبہ کر لیں (اگر کسی کو گالی دی ہو یا کسی سے تمسخر کیا ہو یا چغل خوری کی ہو تو) توبہ کے بعد اس سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔ اور جن لوگوں کے سامنے چغلی یا غیبت کی تھی اس کے سامنے اس کی مدح وثنا بھی کریں اور پہلی بات کا غلط ہونا ظاہر کر دیں اور اگر وہ سچی بات ہو تو کہہ دیں کہ بھائی خود اس بات پر اعتماد نہیں رہا، یہ توریہ ہوگا، کیونکہ سچی بات پر بھی اعتمادِ قطعی بدوں وحی کے نہیں ہو سکتا اور اگر کسی وجہ سے معاف کرانا دشوار ہو تو ادنیٰ درجہ کا علاج یہ ہے کہ اس شخص کے لیے اور اس کے ساتھ اپنے لیے استغفار کرتے رہیں، اس طرح: '' اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَ لَهُ '' (اے اللہ! ہماری اور اس کی مغفرت فرما)۔

(ماخوذ: شریعت اور طریقت)

حافظ محمد ابوبکر شیخوپوری

# تزکیہ نفس، اہمیت وضرورت

اللہ رب العزت نے اپنے کلامِ مقدس میں نبوت کے جو مقاصدِ جلیلہ ذکر فرمائے ہیں۔ان میں سے ایک بنیادی مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''تحقیق ہم نے اہلِ ایمان پر احسان کیا کہ ان میں ایک رسول بھیجا، جو انھیں میں سے ہے، ان پر اس کی کتاب کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے''۔ دوسرے مقام پر تزکیہ نفس کو فوز وفلاح کا مدار قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''تحقیق وہ شخص کامیاب ہوگیا، جس نے خود کو پاک کرلیا''۔

تزکیہ نفس کو علم تصوف، سلوک، احسان اور علم باطن کے عنوانات سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کے حامل کو ''صوفی'' کہا جاتا ہے۔ تصوف کا بنیادی مقصد انسان کی قلبی کیفیات کا قبلہ درست کرنا اور روحانی بیماریوں مثلاً حسد، کینہ، بغض، کبر، عُجب، ریاء اور دیگر رذائل کا علاج کر کے خصائل حمیدہ کو پیدا کرنا ہے، احسان وسلوک کی مبارک منازل جہاں طے کروائی جاتی ہیں اس جگہ کو ''خانقاہ'' اور ''روحانی علاج گاہ'' کہا جاتا ہے۔ اکابر واسلاف کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں علمِ ظاہر اور علمِ شریعت کے ساتھ ساتھ علم باطن اور علم طریقت کے حصول کو بھی ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی جیسے امام علوم وفنون اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ جیسے فقیہ النفس علم کے بحر بے کنار ہونے کے باوجود ایک غیر عالم لیکن فنا فی اللہ شخصیت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے آستانۂ عالیہ پر پہنچے اور تصوف و سلوک کی منازل طے کیں۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ اپنے مواعظ میں بجا طور پر اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ میں جو کچھ بھی ہوں، حضرت حاجی صاحبؒ کی وجہ سے ہوں۔

تصوف کے مبارک سلسلے کے اذکار واوراد واشغال بلاشبہ انسان کی زندگی کا رخ موڑ دیتے ہیں، جاہل شخص کو عاقل اور غافل کو عارف بنانے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں اور دنیا کے بکھیڑوں میں پڑ کر اپنے خالق ومالک کی معرفت سے بے بہرہ شخص کو فنا فی اللہ کے مقام پر فائز کرتے ہیں۔ لیکن بعض خشک مزاج اور فہم ودانش کی نعمت سے محروم لوگ ان اذکار واشغال کو بدعت کہہ کر رد کر دیتے ہیں اور العیاذ باللہ صوفیاء، سالکین اور عارفین کے مقدس طبقہ کو گمراہ اور مبتدع فی الدین کہہ کر ان کی تضحیک کرتے ہیں۔ حالانکہ ان مبارک سلسلوں کی تمام کڑیاں آستانہ نبوت سے ملتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جس طرح علم ظاہر کی دولت سے مالا مال کیا، وہیں دنیا کی محبت کو اپنے ارشادات وفرمودات کے ذریعہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب سے کرید کرید کر نکالا۔ کبھی دنیا کی فنائیت اور بے ثباتی کا تذکرہ کیا تو کبھی حسد، کبر، کینہ، بغض اور خود پسندی جیسے مہلک روحانی امراض کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ کتب

احادیث میں ''رقاق'' اور اخلاق'' کے عنوانات سے قائم ابواب اس پر شاہد ہیں۔

تزکیہ نفس کے مقدس سفر کا آغاز بیعتِ طریقت سے ہوتا ہے اور انتہا درجہ احسان (اخلاص) کے حصول پر ہوتی ہے۔ رابطۂ شیخ، مصاحبت مع الشیخ، تصورِ شیخ، مجاہدات، ذکرِ اسمِ ذات، مرشد کے تجویز کردہ اوراد و وظائف، مراقبہ اور محاسبہ اس سفر کے لیے ''زادِ راہ'' کا درجہ رکھتے ہیں، اگر سالک ان تمام مراحل کو مرشد کی ہدایات کی روشنی میں خوش اسلوبی سے طے کرلے تو ''احسان'' کی منزل تک پہنچ جاتا ہے یعنی عبادات میں اللہ تعالیٰ کی طرف اس کا دھیان اس قدر لگ جاتا ہے کہ گویا کہ وہ اللہ کو اپنے سامنے پاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے یا کم از کم یہ تصور پختہ ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ کیفیات کسی صاحبِ دل صوفی باصفاء اور شریعت کے اسرار و رموز سے آشنا اور جامع شریعت و طریقت کی بیعت، مجالست اور مصاحبت کے بغیر کسی صورت حاصل نہیں ہوسکتی۔

بسا اوقات اولیاء کرام کے ہاتھ پر خرقِ عادت امور کا ظہور ہوتا ہے، انہیں ''کرامات'' کہا جاتا ہے جو کہ اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق برحق ہیں۔ حضرت مریم علیہا السلام کے بند حجرے میں اللہ کی طرف سے بے موسم کے پھلوں کا آنا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مدینہ سے بذریعہ ہوا، حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو پیغام پہنچنا اور قرآن وسنت میں مذکور دیگر واقعات اس پر شاہد ہیں۔ لیکن یہ کرامات، تصوف کے مقصودات میں سے نہیں ہیں کہ ان کے ظہور کے بغیر کسی کی ولایت پر شبہ کیا جائے۔ اس بات کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بعض لوگ بیعت کے لیے ایسے پیر کی تلاش میں رہتے ہیں جو کرامت کے اعتبار سے لوگوں میں مشہور ہو، حالانکہ سب سے بڑی کرامت احکامِ شریعت پر مضبوطی اور استقامت ہے۔ جیسا کہ عربی کا مقولہ ہے: ''الاستقامة فوق الكرامة '' یعنی استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا بیعت کے سلسلہ میں کرامات کو دیکھنے کے بجائے دو چیزوں کو بطورِ خاص ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ایک یہ کہ وہ شخص پابند شریعت ہو اور کسی مستند سلسلے سے مجاز بیعت ہو اور دوسری یہ کہ اس کے ساتھ قلبی مناسبت ہو اور اس سے استفادہ آسان ہو۔

بیعت کے حوالہ سے ہمارے معاشرے میں لوگ افراط و تفریط کا شکار ہیں، ایک طبقہ اس کو دین کا ایسا جزو لاینفک سمجھتا ہے کہ ایسے شخص کو جو کسی سے بیعت نہ ہو، شیطان کا مرید قرار دیتا ہے۔ چنانچہ لوگوں میں مشہور ہے کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے۔ یہ ایک جاہلانہ خیال ہے اور ایک طبقہ اس کو بدعت قرار دے کر اس عمل کی یکسر نفی کر دیتا ہے۔ حالانکہ یہ عمل شریعت کے عین مطابق اور انسان کو باشرع بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ میں ''باب البیعت'' کے تحت چار روایات ذکر کی گئی ہیں، جن میں سمع وطاعت یعنی اطاعتِ خداوندی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیعت لینے کا ہے۔ یہ بیعت نہ بیعت اسلام ہے اور نہ بیعت جہاد بلکہ خالصتاً بیعتِ طریقت ہے۔ لہٰذا راہ اعتدال پر چلتے ہوئے بیعت کی اہمیت وضرورت کو سمجھنا چاہیے اور کسی کامل کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ان سے دینی راہنمائی لینی چاہیے۔

---

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

# حج اور اس کی برکات

اللہ تعالیٰ شانہ نے یوں تو ہر عبادت کے لیے قدم قدم پر رحمت وعنایت اور اَجر وثواب کے وعدے فرمائے ہیں، نماز وزکوٰۃ اور روزہ واعتکاف وغیرہ سب پر جنت اور جنت کی بیش بہا نعمتوں کے وعدے ہیں، لیکن تمام عبادات میں ''حج بیت اللہ'' کی شان سب سے نرالی ہے، حج گویا دبستانِ عبدیت کا آخری نصاب ہے، جس کی تکمیل پر بارگاہ عالی سے رضا وخوشنودی کی آخری سند عطا کی جاتی ہے، کتنے عجیب انداز سے فرمایا گیا ہے:

''والحج المبرور لیس له جزاءٌ الا الجنة''

''اور ''حج مبرور'' ایک ایسی عالی شان عبادت ہے کہ بجز جنت کے اس کا اور کیا بدلہ ہوسکتا ہے۔ ''حج مبرور'' جس کا بدلہ صرف جنت ہی ہوسکتی ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اس میں گناہ کی آلودگی اور ریا کاری کا شائبہ نہ ہو، یعنی تمام سفر حج میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے آدمی بچے اور محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر حج کیا جائے۔ بلاشبہ اس شرط کا نبھانا بھی بہت مشکل ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل ہی سے یہ مشکل مرحلہ طے ہوسکتا ہے

حج کی ظاہری صورت بھی عجیب وغریب ہے اور اس میں غضب کی جاذبیت ہے، قدم قدم پر عشق ومحبت کی پُر بہار منزلیں طے ہوتی ہیں۔ سب سے بڑے دربار کی حاضری کا قصہ ہے، دِل میں دیارِ محبوب کی آرزوئیں مچلتی ہیں، سفر طویل ہے، حلال وطیب توشۂ سفر کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ نیک اور صالح رفیق کی تلاش ہورہی ہے۔ چشم پُرنم کے ساتھ عزیز واقارب سے رخصت ہورہے، لین دین کا حساب بے باق کیا جارہا ہے، حق حقوق کی معافی طلب کی جارہی ہے۔ کوشش یہ ہے کہ اس دربار میں حاضر ہوں تو کسی کا معمولی حق بھی گردن پر نہ ہو۔ لیجیے روانگی کا وقت آیا، غسل کرلیجئے اور دو سفید نئی چادریں پہن لیجئے۔ گویا انسان خود اپنے ارادہ واختیار سے سفر آخرت پر روانہ ہورہا ہے۔ پہلے غسل سے بدن کے ظاہری میل کچیل کو صاف کرتا ہے اور پھر کفن کی چادریں اوڑھ کر دوگانہ احرام ادا کرتا ہے اس طرح گویا توبہ وانابت سے دل کے میل کچیل سے اپنے باطن کو پاک صاف کرتا ہے اور ظاہری وباطنی نظافت کے ساتھ شاہی دربار میں نذرانۂ عشق ومحبت پیش کرنے کا عہد کرلیتا ہے۔ ارحم الراحمین نے دعوت دے کر بلایا ہے اور شاہی دربار سے بلاوا آیا ہے۔ یہ فوراً ''بیت اللہ الحرام'' کے شوق دیدار میں اس دعوت پر لبیک اللّٰھم لبیک (میں حاضر ہوں، اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں) کا نعرہ بلند کرتے ہوئے مستانہ وار سوئے منزل روانہ ہوجاتا ہے۔

یہ اس والہانہ وعاشقانہ عبادت کی ابتداء ہے، زیب وزینت کے تمام مظاہر ختم۔ راحت وآسائش کے تمام تقاضے فراموش...... نہ سر پر ٹوپی، نہ پاؤں میں ڈھب کا جوتا، نہ بدن پر ڈھنگ کا کپڑا، دیوانہ وار رواں دواں منازلِ عشق

طے کرتا ہوا جا رہا ہے۔ دیارِ محبوب کی دُھن میں بادہ پیمائی ہو رہی ہے۔

در بیابانہا ز شوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنشہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

ترجمہ: کعبہ مکرمہ کے شوق میں ویرانوں میں قدم رکھتے ہوں گے، (پھر) اگر نوکیلے کانٹے سرزنش کریں تو غم نہیں کرنا چاہیے۔

پہنچتے ہی مرکزِ تجلیات (کعبہ) پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ دارِ محبوب کا طواف کرتا ہے بار بار چکر لگاتا ہے۔ حجر اسود جو یمین اللہ فی الارض کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو چومتا ہے، آنکھوں سے لگاتا ہے، ملتزم سے چمٹتا ہے، زار وقطار روتا ہے۔ گویا زبانِ حال سے کہتا ہے:

نازم بچشم خود کہ روئے تو دیدہ است
افتم بپائے خویش کہ بکویت رسیدہ است
ہزار بار بوسہ زنم من دست خویش را
کہ بدامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

ترجمہ: مجھے اپنی آنکھ پر فخر ہے کہ یہ تیرا جمال دیکھ چکی ہے۔ میں اپنے پاؤں کے قربان جاتا ہوں کہ یہ تیرے کوچے تک پہنچ چکا ہے۔ میں خود اپنے ہاتھوں کو ہزار بار چومتا ہوں کہ یہ تجھے دامن سے پکڑ کر میری طرف کھینچ چکے ہیں۔

اس بے خود عاشق زار کو، جو قلب تپاں اور جگر سوزاں لے کر آیا تھا، پہلی مہمانی کے طور پر آبِ زم زم کا تحفۂ شیریں پیش کیا جاتا ہے جس سے تسکین قلب بھی ہو گی اور جگر کی پیاس بھی بجھے گی اور حکم ہوتا ہے کہ جتنا پیا جا سکے پی لے، خوب دل ٹھنڈا کر لے کوئی کسر نہ چھوڑے۔ یہاں سے فارغ ہو کر صفا ومروہ کے درمیان چکر لگاتا ہے۔ پھر منیٰ پہنچتا ہے پھر اس سے آگے عرفات کا رخ کرتا ہے۔ آج وادی عرفات سچ مچ ہنگامہ محشر کا منظر پیش کر رہی ہے، حیرت انگیز اجتماع ہے رنگا رنگ شکلیں مختلف زبانیں، بوقلموں مناظر ہیں۔ یہ سب رب العالمین کے دربارِ قدس کے مہمان ہیں۔ یہ شاہی دربار میں عبدیت وبندگی، ضعف وبے کسی، عجز ودرماندگی اور ذلت ومسکنت کا نذرانہ پیش کریں گے اور رضاء ومغفرت، فضل واحسان اور انعام واکرم کے گوہر مقصود سے جھولیاں بھر کر لے جائیں گے۔ اپنے لیے اپنے اعزہ واقارب اور دوست احباب کے لیے آج جو کچھ مانگیں گے نقد ملے گا۔ زوال ہوا تو ہر چہار طرف سے آہ وبکا کا شور برپا ہوا۔ اس کی آواز بھی اس حیرت انگیز طوفان گریہ وزاری میں ڈوب گئی، شام تک کا سارا وقت اسی عالم تحیر میں گذارتا ہے، کبھی خوب رو رو کر مانگتا ہے، کبھی لبیک اللّٰھم لبیک کا نعرہ لگاتا ہے، کبھی تکبیر کی گونج سے زمزمہ آراء ہوتا، کبھی تہلیل سے نغمہ سرا ہوتا ہے، کبھی لاالٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہٗ سے وحدانیت وربوبیت کی صدائیں بلند کرتا ہے۔ عابد ومعبود کا یہ تعلق کتنا دلربا ہے اور بندگی وسرافگندگی کا یہ منظر کس قدر حیرت افزا ہے؟

آفتاب غروب ہوا اور اس دشت پیمانے بوریا بستر باندھ مزدلفہ کا رُخ کیا، شب بیداری وہاں ہوگی۔ مغرب وعشاء کی نماز وہاں پڑھی جائے گی، اظہارِ آداب بندگی میں کچھ کسر باقی رہ گئی ہے تو وہاں نکالی جائے گی۔ کبھی رکوع وسجود ہے، کبھی وقوف وقیام ہے، کبھی تہلیل وتکبیر ہے، کبھی تسبیح وتلبیہ ہے۔ گریہ وزاری، دُعا ومناجات اور تضرع وابتہال کا نصاب پورا ہوا تو کامیابی وکامرانی کی نعمت سے سرشار ہوکر وہاں سے منیٰ کو چلا، دشمن انسانیت، عدو مبین، راندۂ بارگاہ ابلیس لعین کی سرکوبی کے لیے جمرہ کی رمی کی، خلیل وذبیح (علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) کی سنت قربانی کی یاد تازہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی دی اور رضائے محبوب کے لیے جان ومال کے ایثار وقربانی کا عہد تازہ کرلیا۔ وہاں سے بارگاہ قدس کے مرکز انوار کی زیارت کر چلا، اور طواف کعبہ کے انوار وبرکات سے دیدہ ودل کی تسکین کا سامان کیا۔

الغرض اس عاشقانہ ووالہانہ عبادت میں دیوانہ وار ایثار قربانی اور عبدیت وفنائیت کا ریکارڈ قائم کرلیتا ہے اور تجلیاتِ ربانی کے انوار وبرکات سے سراپا نور بن جاتا ہے اور رحمت، رضوان کے تحفوں سے مالا مال ہوکر اور استحقاقِ جنت کی آخری سَند لے کر اپنے وطن کو واپس لوٹتا ہے۔ اس طرح بندہ بندگی کا ثبوت دے کر جنت ورضوان الٰہی کی نعمتوں سے سرفرازی کے تمغۂ وصول کرلیتا ہے۔ ''**والحج المبرور لیس له جزاء الا الجنة**'' (مقبول حج کا بدل جنت سے کم کچھ نہیں ہوسکتا۔ حدیث شریف) کے آخری انعام سے مطمئن ہوجاتا ہے۔ دیکھئے کس انداز سے عشق ومحبت کی منزلیں طے کی گئیں اور کس کس طرح شاباشوں سے نوازا گیا۔ یہ اس عاشقانہ وعارفانہ عبادت کا بہت ہی مختصر سا نقشہ ہے۔

ظاہر ہے کہ مقصد بہت ہی اعلیٰ ہے، اس لیے کبھی کبھی اس مقصد کے حصول کے لیے امتحان بھی ناگزیر ہوتا ہے، مدتوں کے جمے ہوئے تہ بر تہ زنگ وغبار کو دور کرنے کے لیے شدید تنقیہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ کبھی جان پر امتحان آتا ہے، کبھی مال پر کبھی رفقاء سے تنہا کرا کر تڑپایا جاتا ہے، کبھی پٹوا کر رُلایا جاتا ہے، کبھی ہر آسائش وراحت چھین کر آخرت کی آسائش وراحت کی نعمت سے نوازا جاتا ہے۔ بہرحال یہ راز سربستہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ شان ربوبیت کے کریمانہ کرشمے ہیں۔ شان صمدیت کا ظہور ہے اور ارحم الراحمین کی رحمت خفیہ کے شُیون ہیں۔ رحمت الٰہی کا ظہور کبھی بصورت رحمت ہوتا ہے کبھی بشکل زحمت۔ کسی کو چون وچرا کی گنجائش نہیں یہ وہ مقام ہے کہ عارفین، جو دریائے معرفت کے غوطہ زن ہیں وہ بھی سر حیرت جھکا کر خاموش ہیں۔ صبر آزما امتحان لیا جاتا ہے، کبھی جوع وخوف کے، کبھی نفس واموال زیر امتحان ہوتے ہیں، رضا بالقضاء کے لیے مجاہدہ کرایا جاتا ہے اور مہربانی اور شاباش کی بارش ہوتی اور آخر میں جنت کی سند مل جاتی ہے اور ''**والحج المبرور لیس له جزاء الا الجنة**'' کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ عبدیت کا ظہور اور شان عشق ومحبت کا مظاہرہ جس طرح حج بیت اللہ الحرام میں ہوتا ہے کسی اور عبادت میں نہیں ہوتا۔

## دورانِ حج احتیاط

(۱) عورتوں اور مردوں کا ناگفتہ بہ اختلاط طوافوں میں، نماز میں اور سلام کی حاضری میں غیر شرعی ہے۔ اس لیے

ضروری ہے کہ عورتوں کے طواف کے لیے رات یا دن میں کوئی وقت مخصوص کر لیا جائے اور اس طرح سلام کی حاضری کے لیے بھی وقت مخصوص ہو ان اوقات میں مردوں کو طواف یا حاضری سے روکا جائے۔

(۲) نہ تو عورتوں پر جماعت کی پابندی ہے، نہ مسجد کی حاضری کی فضیلت ہے، نہ نماز جمعہ ان پر فرض ہے، اس لیے عورتیں گھر میں نماز پڑھا کریں۔ اور اسی طرح جمعہ میں عورتوں کی حاضری روکی جائے، موجودہ صورتحال نہ شرعاً درست ہے، نہ عقلاً قابل برداشت ہے۔

(۳) رمی جمرات کے لیے عورتیں رات کو جایا کریں، جس طرح بوڑھوں اور مریضوں کے لیے بھی یہی وقفہ مناسب ہے بلاشبہ بغیر عذر کے یہ خلاف سنت ہے، لیکن موجودہ صورت حال میں ان شاء اللہ کراہت بھی ختم ہو جائے گی۔

(۴) اس وقت جو صورتحال ہے قانون وفقہی احکام کے پیش نظر تو یہ اُمید رکھنا بہت مشکل ہے، یہ عبادت صحیح ادا ہوئی یا حج مبرور ہوگا۔ صحیح طواف کیسے ہو؟ اور اس میں کیا کیا باریکیاں ہیں؟ اگر ایک قدم طواف کا ایسا ادا ہو کہ بیت اللہ کی طرف سینہ ہو جائے۔ تو سارا طواف بیکار ہو گیا۔ اگر شروع کرنے میں حجر اسود سے تقدم ہو گیا تو طواف میں نقصان آجاتا ہے، اگر ایک انچ ہٹ کر طواف شروع کیا تو سرے سے طواف ہوا ہی نہیں۔ خاص کر اژدہام و ہجوم میں صحیح طواف کرنا بے حد وشوار مرحلہ ہے عورتیں مردوں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ایک عورت اگر صف میں مردوں کے درمیان کھڑی ہوگئی تو تین مردوں کی نماز غارت ہوگئی، جو شخص دائیں ہو، جو بائیں ہو جو اس کی سیدھ میں پیچھے ہو۔ اگر ایک ہزار عورتیں اس طرح صفوں کے درمیان ہیں تو تین ہزار مردوں کی نماز فاسد ہوگئی۔ دوران سفر بہت سی نمازیں قضاء ہو جاتی ہیں اگر فرض نماز قضاء ہوگئی تو حج مبرور کی توقع رکھنا مشکل ہے۔ الغرض اس طرح دسیوں مسائل ہیں کہ جن سے عوام تو کیا علماء بھی غافل ہیں۔ ''رمی جمرات'' میں معمولی عذر پر دوسروں کو وکیل بنایا جاتا ہے، اس طرح وہ توکیل صحیح نہیں ہوتی۔ دم لازم آجاتا ہے۔ غور کرنے سے محسوس ہوا کہ جہاں تک مسائل و احکام کا تعلق ہے مشکل سے یہ کہا جائے گا کہ یہ حج صحیح ادا ہو گیا لیکن حق تعالیٰ شانہ کی رحمت کاملہ کے پیش نظر کوئی بعید نہیں کہ اگر نیت صحیح ہو اور جذبہ سچا ہو تو تمام کوتاہیاں اور قانونی فروگذاشتیں سب معاف ہوں، اور ارحم الراحمین کی رحمت عامہ سے یہی اُمید ہے کہ اپنے گنہگار بندوں کی کوتاہیوں سے درگزر فرما کر اپنی رحمت ونعمت سے نوازے اور نہ معلوم کس کی کون سی ادا قبول ہو جائے اور کیا کچھ خزانہ رحمت سے ملے اور بلاشبہ حق تعالیٰ شانہ کی رحمت کاملہ کی موسلا دھار بارش میں کوئی بدنصیب ہی محروم رہے گا، ہوسکتا ہے کہ چند مقبولین بارگاہ کے طفیل سب کا حج قبول ہو۔ اس کی شان کریمی کے سامنے سب کچھ آسان ہے۔ کاش اگر حق تعالیٰ کی اتنی مخلوق قانون کے مطابق جذبات صادقہ سے والہانہ انداز سے یہ فریضہ ادا کرتی تو اُمت کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور تمام عالم میں ان نمائندگان بارگاہ قدس کا فیض جاری ہوتا۔ جس حریم قدس کو ان شاندار کلمات سے وحی ربانی میں یاد کیا ہو:

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ. فِيْهِ اٰيٰتٌ م بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (سورۃ آل عمران 96،97)

ان آیات بینات اوران برکات وتجلیات کا کیا ٹھکانا؟ بہر حال کہنا یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ قانون کی رُو سے بھی صحیح حج ہو، اور نیت وجذبہ بھی سچا ہو، اور قدم قدم پر تقصیر کا احساس ہو، اور یہ تصور مستمر قائم ہو کہ اس حریم اقدس میں حاضری کے آداب کی اہلیت کہاں، ہم جیسے ناپاکوں کو اس پاک سرزمین میں حاضری کی دعوت دی گئی اور پہنچ گئے۔ یہ محض حق تعالیٰ شانہ کا عظیم احسان ہے کہ اس مقدس زمین اور بُقعۂ نور میں، سراپا ظلمات والے کو جگہ عطا فرمادی۔ توقع ہے کہ اس احساس سے بارگاہ قدس میں شرف قبولیت نصیب ہو، یہ جو کچھ بیت اللہ کی عظمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ بہت سطحی حقائق کے درجہ میں بات عرض کی گئی، ورنہ جو حقائق واسرار عارفین و کبار صوفیاء کرام، شیخ اکبر امام ربانی شیخ احمد سرہندی، حضرت شیخ سید آدم بنوری، شاہ عبدالعزیز اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہم اللہ جمیعاً نے بیان فرمائے ہیں وہ دائرہ بیان سے بالاتر ہیں۔ راقم الحروف نے اپنے رسالہ ''بُغیة الاریب فی القبلة و المحاریب'' کے آخر میں کچھ تھوڑا سا حصہ بیان کیا ہے۔ بہرحال کعبۃ اللہ اس مادی کائنات میں ''شعائر اللہ'' میں داخل ہے، نماز میں اگر حق تعالیٰ شانہ سے مناجات وہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو حج میں حق تعالیٰ کے گھر میں مہمانی کا شرف ومجد حاصل ہے۔ جب ہم کلامی کی عظمت بیت اللہ الحرام میں نصیب ہو اور دونوں عظمتیں جمع ہو جائیں تو جو کچھ بھی اس کا درجہ ہوگا۔ تصور وخیال سے بالاتر ہے۔

''نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز''

یہ وہ مقام ہے کہ انتہائی تعظیم وادب کی ضرورت ہے لیکن آج کل ہماری غفلت وجہالت سے جو صورت حال ہے وہ ظاہر ہے۔ افسوس یہ کہ ہماری تمام عبادات کی صرف صورت رہ گئی، روح نکل گئی ہے۔ تمام عبادات بے جان لاشے ہیں، اگر ان میں جان ہوتی تو آج اُمت محمدیہ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔ حق تعالیٰ کی رحمت ہے اور اسلام کا حکیمانہ نظام ہے کہ مساجد بھی بیوت اللہ ہیں۔ وأنَّ المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللّٰہ احدا۔ (مساجد صرف اللہ تعالیٰ کی ہیں اُن میں صرف اللہ ہی کی عبادت ہونی چاہیے) آخری سب سے بڑا مرکزی گھر وہ مسجد حرام وہ بیت الحرام ہے، جس سے عالم میں بجز اس مقام کے جہاں حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے ہیں کوئی مقدس قطعہ نہیں، جہاں پر حق تعالیٰ کی طرف کے انوار کی موسلا دھار بارش برستی ہے، فرشتے طواف کے لیے آسمانوں سے اُترتے ہیں، حق تعالیٰ مسلمانوں اور حجاج کرام کو توفیق نصیب فرمائے کہ اس مقام کی صحیح معرفت نصیب ہو۔ بقدر طاقت بشری حق ادا کر سکیں۔ آمین

مولانا ڈاکٹر مفتی عبدالواحد رحمۃ اللہ علیہ

# قربانی کے مسائل

## قربانی کس پر واجب ہے:

جس پر صدقہ فطر واجب ہے، اس پر بقرعید کے دنوں میں قربانی بھی واجب ہے اور اگر اتنا مال نہ ہو کہ جس پر صدقہ فطر واجب ہوتا ہو، تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے، لیکن پھر بھی اگر کر دے تو ثواب ہے۔

مسئلہ: اگر پہلے اتنا مال دار نہ تھا، اس لیے قربانی واجب نہ تھی، پھر بارہویں تاریخ کے سورج ڈوبنے سے پہلے کہیں سے مال مل گیا تو قربانی کرنا واجب ہے۔ قربانی مقیم پر واجب ہوتی ہے، مسافر پر نہیں۔

مسئلہ: قربانی کے تینوں دن اقامت کا ہونا شرط نہیں ہے۔ دسویں، گیارہویں تاریخ کو سفر میں تھا، پھر بارہویں تاریخ کو سورج ڈوبنے سے پہلے گھر پہنچ گیا یا پندرہ دن کہیں ٹھہرنے کی نیت کر لی تو اب قربانی کرنا واجب ہو گیا۔

مسئلہ: جو شخص حج پر گیا اور حساب سے شرعی مسافر بنتا ہو تو اس پر قربانی واجب نہیں مثلاً ایک شخص ۲۵ ذی قعدہ کو مکہ مہ پہنچا۔ اب چونکہ منیٰ عرفات جانے میں پندرہ روز سے کم ہیں اس لیے یہ شخص مکہ مکرمہ میں اقامت کی نیت بھی کر لے تب بھی مقیم نہیں مسافر ہی رہے گا۔ اس لیے خواہ یہ شخص حج سے پہلے مدینہ منورہ جائے یا نہ جائے بارہ ذی الحج تک یہ مسافر رہے گا اور اس پر قربانی واجب نہ ہو گی۔

## قربانی کا وقت:

مسئلہ: ذوالحجہ کی دسویں تاریخ سے لے کر بارہویں تاریخ کے سورج ڈوبنے سے پہلے تک قربانی کا وقت ہے چاہے جس دن قربانی کرے لیکن قربانی کا سب سے بہتر دن دسویں کا ہے۔ پھر گیارہویں تاریخ پھر بارہویں تاریخ۔

مسئلہ: دسویں تاریخ کو شہر والوں کے لیے قربانی کا مستحب وقت عید کی نماز اور خطبہ کے بعد ہے جب کہ گاؤں والوں کے لیے کہ جس میں عید کی نماز نہیں ہوتی سورج طلوع ہونے کے بعد ہے۔

مسئلہ: گاؤں والوں کے لیے دسویں تاریخ کو فجر کی نماز کے بعد بھی قربانی کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: امام عید کی نماز پڑھا چکا لیکن ابھی خطبہ نہیں پڑھا کہ کسی نے قربانی کر دی تو قربانی جائز ہے۔

مسئلہ: امام کے نماز پڑھانے کے دوران میں قربانی کی تو قربانی نہیں ہو گی۔

مسئلہ: اگر عید کی نماز ہوئی اور پھر لوگوں نے قربانی کی۔ بعد میں بات ظاہر ہوئی کہ وہ دن دسویں کا نہیں نویں ذی الحجہ کا ہے اور چاند دیکھنے میں غلطی ہو گئی تھی تو اگر باقاعدہ گواہی سے چاند کے ہونے کا اعلان کیا گیا تھا تو نماز اور قربانی دونوں جائز ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ: اگر کوئی شہر کا رہنے والا اپنی قربانی کا جانور کسی گاؤں میں بھیج دے تو وہاں اس کی قربانی عید کی نماز سے پہلے بھی درست ہے اگر چہ وہ خود شہر ہی میں موجود ہو۔ ذبح ہو جانے کے بعد چاہے تو اس کو منگوالے اور گوشت کھائے۔

مسئلہ: بکرا، بکری، بھیڑ، دنبہ، گائے، بیل، بھینس، بھینسا، اونٹ، اونٹنی، ان جانوروں کی قربانی درست ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور جانور کی قربانی درست نہیں۔

مسئلہ: بکری سال بھر سے کم کی درست نہیں۔ جب پورے سال بھر کی ہو تب قربانی درست ہے۔ اور گائے، بھینس، دو برس سے کم کی درست نہیں۔ پورے دو برس کی ہو چکے تب قربانی درست ہے۔ اونٹ پانچ برس سے کم کا درست نہیں ہے۔

تنبیہ: بکری جب پورے ایک سال کی ہو جاتی ہے اور گائے جب پورے دو سال کی ہو جاتی ہے اور اونٹنی جب پورے پانچ سال کی ہو جاتی ہے۔ تو اس کے نچلے جبڑے کے دودھ کے دانتوں میں سے سامنے کے دو دانت گر کر دو بڑے دانت نکل آتے ہیں۔ نر اور مادہ دونوں کا یہی ضابطہ ہے۔ تو ان دو بڑے دانتوں کی موجودگی جانور کے قربانی کے لائق ہونے کی اہم علامت ہے لیکن اصل یہی ہے کہ جانور اتنی عمر کا ہو اس لیے اگر کسی نے خود بکری پالی ہو اور وہ چاند کے اعتبار سے ایک سال کی ہو گئی ہو لیکن اس کے دو دانت ابھی نہ نکلے ہوں تو اس کی قربانی درست ہے۔ لیکن محض عام بیچنے والوں کے قول پر کہ یہ جانور پوری عمر کا ہے اعتماد نہیں کر لینا چاہیے اور دانتوں کی مذکورہ علامت کو ضرور دیکھ لینا چاہیے۔

مسئلہ: دنبہ یا بھیڑ اگر اتنا موٹا تازہ ہو کہ سال بھر کے جانوروں میں رکھیں تو سال بھر کا معلوم ہوتا ہو تو سال بھر سے کم لیکن چھ ماہ سے زائد عمر کے دنبہ اور بھیڑ کی قربانی بھی درست ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو سال بھر کا ہونا چاہیے۔

مسئلہ: جو جانور اندھا یا کانا ہو یا ایک آنکھ کی تہائی روشنی سے زیادہ جاتی رہی ہو تو اس کی قربانی درست نہیں۔

مسئلہ: جس جانور کا ایک کان تہائی سے زیادہ کٹ گیا ہو یا دم تہائی سے زیادہ کٹی ہو تو قربانی درست نہیں۔

مسئلہ: جو جانور اتنا لنگڑا ہے کہ فقط تین پاؤں سے چلتا ہے چوتھا پاؤں رکھا ہی نہیں جاتا یا چوتھا پاؤں رکھتا ہے اس سے چل نہیں سکتا اس کی بھی قربانی درست نہیں اور اگر چلتے وقت وہ پاؤں زمین پر ٹیک کر چلتا ہے اور چلنے میں اس سے سہارا لگتا ہے۔ لیکن لنگڑا کر چلتا ہے تو اس کی قربانی درست ہے۔

مسئلہ: اتنا دبلا بالکل مریل جانور جس کی ہڈیوں میں بالکل گودا نہ ہو اس کی قربانی درست نہیں اور اگر اتنا دبلا نہ ہو تو دبلے ہونے سے کچھ ضرر نہیں۔ اس کی قربانی درست ہے۔ لیکن موٹے تازے جانور کی قربانی کرنا زیادہ بہتر ہے۔

مسئلہ: جس جانور کے دانت بالکل نہ ہوں اس کی قربانی درست نہیں اور اگر کچھ دانت گر گئے لیکن جتنے باقی ہیں ان سے اگر وہ چارہ کھا سکتا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔

مسئلہ: جس جانور کی پیدائش ہی سے سینگ نہیں ہیں یا سینگ تو تھے لیکن ٹوٹ گئے یا اوپر سے خول اتر گیا تو اس کی قربانی درست ہے۔ البتہ اگر سینگ جڑ سے یعنی دماغ کی ہڈی کے سرے سے ٹوٹ گئے ہوں یا اکھڑے گئے ہوں اور چوٹ کا اثر دماغ تک پہنچ گیا ہو تو ایسے جانور کی قربانی درست نہیں۔

مسئلہ: رسولی والے جانور کی قربانی درست ہے۔

مسئلہ: بکری کا اگر ایک تھن یا اس کا سرا کسی آفت سے جاتا رہا ہو یا پیدائش سے ہی نہ ہو تو اس کی قربانی درست نہیں۔ اونٹنی اور گائے کے اگر دو تھن یا ان کے سرے نہ ہوں تو قربانی نہ ہوگی اور اگر صرف ایک نہ ہو تو قربانی ہو جائے گی۔

مسئلہ: بکری کے ایک تھن اور گائے یا اونٹنی کے دو تھنوں سے دودھ اترنا بند ہو گیا ہو یعنی وہ سوکھ گئے ہوں اور باقی سے دودھ آتا ہو تو اس کی قربانی درست نہیں۔

مسئلہ: بانجھ جانور کی قربانی درست ہے خواہ وہ ابتداء ہی سے بانجھ ہو یا بعد میں ہو گیا ہو۔

مسئلہ: حاملہ جانور کی قربانی ہو جاتی ہے لیکن جس کی ولادت قریب ہو اس کو ذبح کرنا مکروہ ہے۔ بچہ جو پیٹ میں سے نکلے وہ اگر زندہ ہو تو اس کو بھی ذبح کر لیا جائے اور اس کا بھی کھانا حلال ہوگا اور اگر وہ مردہ نکلے تو اس کو کھانا جائز نہیں۔

مسئلہ: خصی جانور کی قربانی درست ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ نے دو سینگ دار اور چتکبرے خصی مینڈھوں کی قربانی کی۔

مسئلہ: اگر جانور قربانی کے لیے خرید لیا تب کوئی ایسا عیب پیدا ہو گیا جس سے قربانی درست نہیں تو اس کے بدلے دوسرا جانور خرید کر قربانی کرے۔ ہاں اگر غریب آدمی ہو جس پر قربانی کرنا واجب نہیں تو اس کے واسطے درست ہے کہ اسی جانور کی قربانی کر دے۔

مسئلہ: اگر ذبح کرتے وقت کوئی عیب لگ جائے تو وہ معاف ہے اور قربانی درست ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: گائے، بھینس، اونٹ، میں اگر سات آدمی شریک ہو کر قربانی کریں تو بھی درست ہے لیکن شرط یہ ہے کہ کسی کا حصہ ساتویں سے کم نہ ہو اور سب کی نیت قربانی کرنے کی یا عقیقہ کی ہو صرف گوشت کی نیت نہ ہو۔ اگر کسی کا حصہ ساتویں حصہ سے کم ہوگا تو کسی کی قربانی درست نہ ہوگی۔ مثلاً آٹھ آدمیوں نے مل کر ایک گائے خریدی اور اس کی قربانی کی تو درست نہ ہوگی کیونکہ ہر ایک کا حصہ ساتویں سے کم ہے۔ اسی طرح ایک بیوہ اور اس کے لڑکے کو ترکے میں گائے ملی اور انھوں نے اس مشترکہ گائے کی قربانی کی تو درست نہیں کیونکہ اس میں بیوہ کا حصہ ساتویں سے کم ہے۔

مسئلہ: گائے اونٹ میں بجائے سات حصوں کے صرف دو حصے ہوں یعنی دو آدمی مل کر ایک گائے یا اونٹ ذبح کریں اور اس طرح اگر دونوں میں سے ہر ایک کے حصہ میں ساڑھے تین حصے ہوتے ہوں تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ دونوں میں سے کسی کا حصہ ساتویں حصہ سے کم نہیں ہے۔ اسی طرح اگر تین یا چار یا پانچ یا چھ آدمی مل کر ایک گائے کی قربانی کریں تو جائز ہے۔

مسئلہ: کسی نے قربانی کے لیے گائے خریدی اور خریدتے وقت یہ نیت کی کہ اگر کوئی اور مل گیا تو اس کو بھی اس گائے میں شریک کر لیں گے اور قربانی کریں گے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ گائے میں شریک ہو گئے تو یہ درست ہے۔

مسئلہ: ایک شخص نے اپنی قربانی میں پوری گائے یا اونٹ ذبح کیا تو کل کا کل واجب قربانی میں شمار ہوگا اور اگر ایک شخص نے اپنی قربانی میں دو بکریاں ذبح کیں تو ان میں سے ایک واجب اور ایک نفلی ہوگی۔

مسئلہ: کوئی شخص اپنے مال میں سے بطور ایصال ثواب میت کی طرف سے قربانی کرے تو اس میں دو صورتیں ہیں ایک

یہ کہ اپنی طرف سے ایک حصہ قربانی کر کے اس کا ثواب میت کو پہنچادے۔ دوسرے یہ کہ اپنی میت کا نام قربانی کے حصہ پر قرار دے کر قربانی کرے۔ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں اور دونوں صورتوں میں قربانی کرنے والے کو اختیار ہے جتنا چاہے خود کھائے اور جتنا چاہے فقراء کو دے۔

مسئلہ: جو قربانی دوسرے کی طرف سے بطور ایصال ثواب کی جائے چونکہ وہ قربانی کرنے والے کی ملکیت ہوتی ہے اور دوسرے کو صرف ثواب پہنچتا ہے اس لیے قربانی کا ایک حصہ ایک سے زائد لوگوں کی طرف سے کیا جاسکتا ہے۔

**قربانی کا گوشت اور کھال:**

مسئلہ: یہ افضل ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کرے۔ ایک حصہ اپنے لیے رکھے ایک حصہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے اور ایک حصہ فقراء پر صدقہ کرے۔ اگر کوئی زیادہ حصہ فقراء پر صدقہ کر دے تو یہ بھی درست ہے اور اگر اپنی عیال داری زیادہ ہے اس وجہ سے سارا گوشت اپنے گھر میں رکھ لیا تو یہ بھی جائز ہے۔

مسئلہ: قربانی کا گوشت فروخت کرنا جائز نہیں۔ اگر کسی نے فروخت کر دیا ہو تو اس کی قیمت صدقہ کرنا واجب ہے۔

مسئلہ: قربانی کی کھال یا تو یونہی خیرات کر دے یا اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت صدقہ کر دے۔

مسئلہ: گوشت یا کھال کی قیمت کو مسجد کی مرمت یا کسی اور نیک اور رفاہی کام میں لگانا جائز نہیں۔ صدقہ ہی کرنا چاہیے۔

مسئلہ: جس طرح قربانی کا گوشت غنی کو دینا جائز ہے۔ اسی طرح کھال بھی غنی کو دینا جائز ہے جب کہ اس کو بلاعوض دی جائے اس کی کسی خدمت و عمل کے عوض میں نہ دی جائے۔ غنی کی ملک میں دینے کے بعد وہ اگر اس کو فروخت کر کے اپنے استعمال میں لانا چاہے تو جائز ہے۔

مسئلہ: قربانی کا گوشت چربی یا کھال کافر کو دینا جائز ہے بشرطیکہ کسی کام کی اجرت میں نہ دی جائے۔

مسئلہ: گوشت یا چربی یا کھال قصائی کو مزدوری میں نہ دے بلکہ مزدوری اپنے پاس سے الگ دے۔

مسئلہ: سات آدمی گائے میں شریک ہوئے اور آپس میں گوشت تقسیم کریں تو تقسیم میں اٹکل سے کام نہ لیں بلکہ خوب ٹھیک ٹھیک تول کر بانٹیں کیونکہ کسی حصہ کے کم یا زیادہ ہونے میں سود ہو جائے گا خواہ شریک اس پر راضی بھی ہوں۔ اور جس طرف گوشت زیادہ گیا ہے اس کا کھانا بھی جائز نہیں۔ البتہ اگر گوشت کے ساتھ سری پائے اور کھال کو بھی شریک کر لیا تو جس طرف اگر گوشت ہو تو درست ہے چاہے جتنا کم ہو۔ جس طرف گوشت زیادہ ہو اس طرف سری پائے بڑھائے گئے تو اب بھی سود رہا۔

مسئلہ: اگر ایک جانور میں کئی آدمی شریک ہیں اور وہ سب آپس میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ ایک ہی جگہ کچا یا پکا کر فقراء واحباب میں تقسیم کریں تو یہ بھی جائز ہے۔

مسئلہ: تین بھائی یا زیادہ یعنی سات بھائی تک ایک گائے میں شریک ہوں اور کہیں کہ اپنی اپنی ضرورت کا گوشت لے اور باقی فقراء پر تقسیم کر دو تو یہ جائز نہیں بلکہ یا تو پہلے کچھ فقراء کو دے کر پھر باقی کو برابر برابر تقسیم کر لیں یا پہلے برابر برابر تقسیم کریں پھر ہر ایک اپنے حصہ میں سے فقراء کو دے۔

سید محمد کفیل بخاری تیسری و آخری قسط

# مفکر اسلام علامہ ڈاکٹر خالد محمود رحمۃ اللہ علیہ

31 اگست 1992ء کو جناح ہال لاہور میں مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں جلسہ تھا۔ ابن امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے۔ اکثر خطباء اپنی تقاریر کر چکے اور اب صاحبِ صدر کے خطاب کا اعلان ہونا تھا کہ اچانک حضرت علامہ خالد محمود اور حافظ عبدالرشید ارشد (مکتبہ رشیدیہ) رحمھما اللہ ہال میں داخل ہوئے۔ میں انہیں سٹیج پر لے آیا۔ عرض کیا کہ ایک تو مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ پاکستان تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ورنہ آپ کو جلسے میں خطاب کی دعوت دیتا۔ دوسرا یہ کہ اب آخری تقریر حضرت ابن امیر شریعت کی ہونی ہے اور ہال کا وقت ختم ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ آپ تشریف لے آئے ہیں تو چند منٹ کے لیے دعائیہ کلمات ارشاد فرما دیں۔ آپ کے بعد حضرت شاہ صاحب کا خطاب ہوگا۔ فرمانے لگے کہ:

> ''میں حافظ عبدالرشید صاحب کے مکتبہ رشیدیہ پر آیا تو آپ کے جلسے کا علم ہوا۔ حافظ صاحب احرار کے پرانے کارکن اور جلسے سننے کے بے حد شوقین ہیں۔ پھر حضرت امیر شریعت کی یاد میں جلسہ ہو اور میں سنے کے بغیر پاس سے گزر جاؤں، ممکن نہیں۔ سو ہم دونوں آ گئے ہیں''۔

ڈاکٹر محمد عمر فاروق سٹیج سیکرٹری تھے۔ انہوں نے میری ہدایت کے مطابق اعلان کیا اور کہا کہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ حضرت علامہ خالد محمود جلسے میں تشریف لے آئے ہیں۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ چند دعائیہ کلمات ارشاد فرما دیں۔ حضرت علامہ خالد محمود مائیک پر آئے اور فرمایا:

''منتظمین نے دعا کیساتھ ایک لفظ کا اضافہ کیا کہ دعائیہ کلمات؟ میں اسی سوچ میں کھویا ہوا ہوں کہ دعائیہ کلمات کیا ہوتے ہیں۔ دعا تو سمجھ آئی لیکن دعائیہ کلمات سے میں اس وقت سمجھا ہوں کہ حضرت امیر شریعت کی یاد میں یہ جو تقریب منعقد ہو رہی ہے اس کے بارے میں دو چار کلمات ہو جائیں پھر دعا ہو''

مجتہد لوگ مر نہیں سکتے ، وہ فقط راستہ بدلتے ہیں
ان کے نقش قدم پر صدیوں تک منزلوں کے چراغ جلتے ہیں

دورانِ خطاب ارشاد فرمایا: ''انگریز دور میں ڈپٹی کمشنر اور گورنر اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد اس دور کے باغیوں کے بارے میں ایک جملہ لکھتے تھے، ایسے ہی حضرت امیر شریعتؒ کے بارے میں لکھا: ''سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایسی شخصیت ہیں جن کو خریدا نہیں جاسکتا''۔ یہ ایک ایسا جملہ ہے جس کی شرح کی جائے تو گھنٹوں چاہییں۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھودیے
پالا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

حضرت شاہ صاحب جب میدان میں آئے تو ان پر اعتماد کا ہاتھ علم کے باب میں مولانا انور شاہ کشمیری نے رکھا، ان کے جوہر کو جوہر نے مانا (مولانا محمد علی جوہرؒ)

شاہ صاحب اس درجے کے خطیب تھے جس کا اظہار و اقرار مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا، شاہ صاحب کا اخلاص چودھری افضل حق نے مانا۔ ہندوستان میں بڑے بڑے لیڈر آئے، بڑے بڑے سیاست دان آئے، بڑے بڑے مفکر آئے لیکن کم ہی ایسا ہوا کہ کسی لیڈر نے جو کچھ کہا ہو اور وہ ہو گیا ہو۔ اگر آپ تاریخ رفت کو آواز دو تو صرف دو لیڈر ملتے ہیں پورے برصغیر کی تاریخ میں جنہوں نے جو کہا وہ ہو گیا ہو۔ ایک قائداعظم محمد علی جناح جنہوں نے کہا ملک کو تقسیم ہونا ہے اور پاکستان کو بننا ہے تو جو کہا وہ ہوا یا نہیں؟ دوسرے حضرت امیر شریعتؒ نے کہا کہ اس ملک میں قادیانی مسلمان شمار نہیں ہوں گے اور یہ تمہیں ماننا پڑے گا۔ تو شاہ صاحب نے جو کہا وہ ہو کر رہا۔

ہمارا خون بھی شامل ہے تزئینِ گلستاں میں
ہمیں بھی یاد کر لینا چمن میں جب بہار آئے

میں بات ختم کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں میں نے آپ کے سامنے دو لیڈر پیش کیے۔ قائداعظم محمد علی جناح اور امیر شریعت۔ قائداعظم نے جو کہا وہ ہو کر رہا لیکن قائداعظم نے جو جنگ جیتی تھی ان کے جانشین وہ جنگ آدھی ہار گئے اور ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور جب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا رہا تھا تو اس وقت یہ مسئلہ حضرت امیر شریعت کے وارثوں اور نمائندوں کے پاس پیش ہوا کہ جو قادیانی ہے وہ تو غیر مسلم ہے لیکن لاہوری عقیدہ کے جو مرزائی ہیں ان کو قبول کر لو۔ لیکن شاہ صاحب نے جو وارث اور اس مسئلہ کے جو علمبردار چھوڑے تھے انہوں نے کہا کہ اسلام تقسیم قبول نہیں کرتا۔ اسلام ایک امر بسیط ہے۔ ہو گا تو پورا ہو گا، نہیں ہو گا تو کچھ نہیں ہو گا۔

۲۴ فروری ۱۹۸۹ء کو دار بنی ہاشم ملتان میں امیر المؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی یاد میں جلسہ تھا۔ حضرت علامہ خالد محمود جلسے میں شرکت کے لیے ایک روز قبل ملتان تشریف لائے تو حسب معمول جانشین امیر شریعت حضرت مولانا سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمہ اللہ اور مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ سے ملاقات کے لیے بھی تشریف لائے۔ اگلے روز انہوں نے دار بنی ہاشم میں جو خطاب کیا وہ بے مثال تھا۔ آپ کا یہ خطاب شائع بھی ہو چکا ہے۔ طوالت کے پیش نظر دو تین جملے نقل کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اپنے پیارے نواسے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ:

میرا یہ بیٹا سردار ہے اور عنقریب یہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں میں صلح کرائے گا۔ اس حدیث میں ''فئتین عظیمتین'' کے الفاظ ہیں۔ عظیم گروہ ہے، باغی نہیں۔ فئہ عظیم فرمایا ہے، فئہ باغیہ نہیں۔ اس لیے سیدنا معاویہ یا سیدنا علی رضی اللہ عنہما میں سے کسی کو باغی کہنا حدیث کے خلاف ہے''

قارئین کے مطالعے کے لیے علامہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ تقریر نقیب ختم نبوت کی آئندہ کسی اشاعت میں شامل کردی جائے گی ان شاء اللہ۔

۱۰ محرم الحرام کو سال ہا سال سے دار بنی ہاشم میں مجلس ذکر حسین رضی اللہ عنہ منعقد ہوتی ہے۔ یہ ۱۰ محرم ۱۴۲۳ھ / ۲۵ مارچ 2000ء کی بات ہے کہ حضرت علامہ ملتان تشریف لائے ہوئے تھے میں نے غنیمت جانا اور حضرت کو دعوت خطاب دی جو انہوں نے منظور فرمالی۔ اتفاق یہ ہوا کہ تمام مقررین کی زبان بندی کا حکم آ گیا۔ چنانچہ صرف حضرت علامہ نے ہی مجلس ذکر حسین رضی اللہ عنہ سے خطاب فرمایا۔ جس اعتدال کے ساتھ انہوں نے مسلک اہل سنت کے مطابق سانحۂ کربلا پر گفتگو فرمائی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ دیگر موضوعات کی طرح علم تاریخ پر بھی انہیں کمال دسترس اور عبور حاصل تھا۔ انہوں نے علم و عقل کی روشنی میں ایسی مدلل گفتگو فرمائی کہ سننے والوں کے کانوں میں آج بھی اس کی گونج باقی ہے۔

حادثۂ کربلا پر آپ کی دس تقاریر پر مشتمل کتاب ''محرم کی دس راتیں'' مسلک حق کی ترجمان اور متلاشیان حق کے لیے بہترین کتاب ہے۔ ان تقاریر کی ویڈیوز بھی وائرل ہو چکی ہیں۔ حضرت علامہ خالد محمود رحمہ اللہ ہمیشہ علماء دیوبند کے فکری، اعتقادی اور مسلکی منہج پر رہے اور اُن کی ترجمانی کا حق ادا کیا۔

اگست 1999ء کی ایک سہ پہر حضرت علامہ رحمہ اللہ دفتر مجلس احرار اسلام لاہور میں ابن امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ حضرت علامہ، شاہ جی کے روبرو بیٹھے تھے۔ یہ ایک گھنٹے کی ملاقات تھی جس کے حسین نقوش آج تک میرے دل و دماغ پر مرتسم ہیں۔ حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کا بار بار تذکرہ کرتے اُن کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے رہے۔ اُدھر بارش کی رم جھم، اِدھر آنسوؤں کی برسات۔ عجیب سماں تھا۔ امرتسر میں حضرت امیر شریعت سے ملاقاتوں اور ان کی شفقتوں کا مسلسل ذکر کرتے رہے۔ پھر قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء تحریک تحفظ ختم نبوت میں حضرت امیر شریعت اور مجلس احرار اسلام کے تاریخ ساز قائدانہ کردار اور قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے۔ واپس جاتے ہوئے بار بار پلٹ کر حضرت سید عطاء المحسن بخاری کو دیکھتے اور آنسو پونچھتے رہے۔ میں نے سواری کا انتظام کرنے کی درخواست کی تو منع فرمایا اور بارش میں ہی ویگن پر سوار ہو کر رخصت ہوئے۔ دفتر سے ویگن سٹاپ تک راستے میں مجھے بار بار فرماتے۔

''بھائی عطاء المحسن، امیر شریعت کی نشانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و عمل اور تقویٰ کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ شاہ جی کی صفت خطابت بھی ان کو عطاء ہوئی ہے۔ اب ان جیسا خطیب بھی کوئی نہیں۔ میرے عزیز! ان کی خدمت اور قدر کرو۔ ان سے جو فیض مل سکتا ہے حاصل کر لو۔ بڑی نسبت والے ہیں اور اس کے امین و محافظ بھی ہیں''

جب بھی حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا علم و حکمت کے موتیوں سے جھولی بھر کے اٹھا۔ کبھی خالی واپس نہیں لوٹا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بہت علمی مواد ہوتا۔ ہمارے مبلغ ختم نبوت مولانا محمد مغیرہ نے ایک مجلس میں کسی مرزائی کا سوال پیش کیا تو فرمایا:

''مولوی صاحب! ہر سوال کا جواب دینا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ بعض اوقات جواباً الزامی سوال

کر کے معترض کو امتحان میں ڈال دیں۔ وہ سوچتا رہے اور آپ آگے بڑھ جائیں''

ایک دفعہ مجھے فرمانے لگے:

''فن مناظرہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ مخالف کی بات سننے کے دوران کہتے رہیں کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مخالف آپ کے سوال کا جواب دینے کی صلاحیت سے محروم ہوجائے گا۔ آپ مخالف کی گفتگو سے ہی اس کے مؤقف کی تردید کرتے ہوئے دلائل پیش کریں اور کہیں کہ آپ ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے''

یہ بات حضرت علامہ نے تو بڑی آسانی سے بیان فرمادی۔ لیکن میں سوچتا رہا کہ اس کو روبہ عمل لانا کتنا مشکل ہے۔ یقیناً اس کے لیے علم، تقویٰ اور تجربہ تینوں ضروری ہیں۔ تب کہیں یہ مشکل گھاٹی عبور ہوسکتی ہے اور حضرت علامہ اس میدان کے شناور تھے۔

حضرت علامہ خالد محمود رحمہ اللہ سے آخری ملاقات جنوری 2020ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہوئی۔ میرے ساتھ ڈاکٹر محمد آصف بھی تھے۔ میں نے ان کا تعارف کرایا کہ ڈاکٹر آصف، مجلس احرار اسلام کے شعبۂ دعوت وتبلیغ کے ناظم ہیں۔ سابق قادیانی ہیں اور کئی قادیانیوں کو دعوت کے ذریعے مسلمان کرچکے ہیں۔ حضرت علامہ چونکے اور ان کی طرف متوجہ ہوکر فرمانے لگے:

''اب صرف کانفرنسیں کرنے سے کام نہیں چلے گا، دلیل، علم، عمل اور اخلاق کے بغیر دعوت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ نومسلموں کا معاشی تحفظ بھی انتہائی ضروری ہے''

مجھے فرمانے لگے:

''نئی نسل مولویوں کے رویوں سے باغی ہوکر ہمارے ہاتھوں سے نکل چکی۔ نئی نسل کا یہ عقیدہ ہے کہ مولوی جاہل ہیں۔ زبان وقلم میں شائستگی کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ سے باخبر ہونا اور عصری علوم سے استفادہ کرنا بھی داعی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ نئی نسل تک دین کا پیغام پہنچانے کے لیے ہم مولویوں کو اپنے اخلاق بلند کرنا ہوں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ اخلاق اچھے کرنے کی نصیحت فرمائی ہے۔ اپنے اخلاق بلند کریں، سماجی رویے بہتر کریں، لوگوں سے محبت کریں اور علم سے تعلق مضبوط کریں۔ تب محنت کامیاب ہوگی''

پھر فرمانے لگے:

''حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ میں یہ خوبیاں نمایاں تھیں۔ شاہ جی علماء میں ایک منفرد شخصیت تھے۔ ایسی نرالی شان والا کھرا انسان میں نے کوئی نہیں دیکھا''

وہ سب کے محبوب تھے اور مخلوق سے محبت کرنے والے تھے۔ انہوں نے بہادروں اور مخلصوں کی جماعت مجلس احرار اسلام بنائی اور تحفظ ختم نبوت کے لیے سب کچھ قربان کردیا۔ ملاقات کے بعد واپس لوٹا تو رات گئے تک اُن کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ ذہن کھلتا چلا گیا اور کام کرنے کی اُمنگ بڑھتی چلی گئی۔ اللہ تعالیٰ حضرت علامہ خالد محمود کی قبر پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے۔ ان کی دینی خدمات قبول فرما کر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

نوراللہ فارانی

# سید عطاءاللہ شاہ بخاری کے آٹوگراف

شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں: لکھنے لکھانے کا شوق کبھی نہ تھا،البتہ خطوط کا جواب سفر وحضر دونوں صورتوں میں خود لکھتے ۔(سید عطاءاللہ شاہ بخاری......سوانح وافکار ص:۳۶)اسی کتاب میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: قرطاس وقلم سے انہیں چڑ تھی ۔با ایں ہمہ شاہ جی کے نثری ذخیرہ میں چند مضامین ایک دو مقدمات اور متعدد خطوط شامل ہیں جو ان کے تحریری بانکپن کا پتہ دیتے ہیں ۔عموماً آٹوگراف دینا پسند نہیں کرتے تھے،فرماتے میں درویش آدمی ہوں یہ باتیں لیڈروں کو زیب دیتی ہے،آٹوگراف کو انگریزی بدعت سے تعبیر کرتے ۔آٹوگراف لینے والے کو اپنی خداداد برجستہ گوئی اور گفتگو کے خطیبانہ طرز میں خوب سمجھاتے اور آٹوگراف دینے سے پہلوتہی کر لیتے ۔جناب ندیم انبالوی مرحوم لکھتے ہیں: ایک دفعہ میں شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔میں نے حسب عادت آٹوگراف کیلئے بک ان کی طرف بڑھائی ۔شاہ جی فرمانے لگے: میں تو ایک درویش آدمی ہوں ۔یہ باتیں لیڈروں کو زیب دیتی ہیں ۔بھائی میں لیڈر نہیں ہوں ۔میں نے بہت اصرار کیا،مگر شاہ جی نہ مانے ۔(ماہنامہ نقیب ختم نبوت امیر شریعت نمبر،حصہ دوم،ص ۵۰۶)

منظور احمد بھٹی مرحوم لکھتے ہیں: ایک زمانے میں مجھے بڑے لوگوں سے ان کے دستخطوں کے ساتھ کوئی پیغام لینے کا بڑا شوق تھا۔اس مقصد کے لیے میں نے ایک بڑی خوبصورت کاپی بنا رکھی تھی ۔شاہ جی دفتر احرار (لاہور) میں محفل جمائے بیٹھے تھے ۔میں نے ڈرتے ڈرتے کاپی ان کے آگے بڑھا دی ۔دیر تک کاپی کی تعریف کرتے رہے اور مسکرا کر فرمایا: کیوں میاں یہ مجھے تحفہ دے رہے ہو ۔؟ عرض کیا: شاہ جی اس پر آپ اپنے قلم سے کچھ لکھ دیں ۔فرمایا: نہ بھئی،اتنی خوبصورت کاپی میں کیوں خراب کروں؟ شاہ جی! یہ اسی مقصد کے لیے ہے ۔یہ آٹوگراف بک ہے ۔شاہ جی ذرا غصے میں آ گئے ۔فرمایا: وہی انگریزی بدعت اور اس کے ساتھ ہی کاپی مجھے واپس لوٹانے لگے ۔دوبارہ عرض کیا: شاہ جی اس پر اپنی طرف سے کوئی پیغام لکھ دیجئے ۔فرمانے لگے میں کیا اور میرا پیغام کیا؟ پیغام لانے والا (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرہ سو سال پیشتر جو پیغام لایا تھا اس پر تم لوگ کیا عمل کر رہے ہو؟ اسی پیغام کو سمجھو اور اسی پر عمل کرو ۔دنیا وعقبیٰ سنوارنے کے لئے کافی ہے ۔(ماہنامہ نقیب ختم نبوت کا امیر شریعت نمبر حصہ دوم،ص ۲۲۲)

بعض لوگ آٹوگراف لینے کے بڑے دیوانے ہوتے ہیں اپنی پسندیدہ شخصیات کے آٹوگراف لینا جنون کی حد تک پسند کرتے ہیں ۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں ۔اب تو خیر سے یہ شوق جان کنی کی حالت میں ہے مگر اب بھی بعض افراد کو یہ شوق دامن گیر رہتا ہے جس کے لیے وہ اپنی آئیڈیل شخصیات کی دامن گیری کرتے نظر

آتے ہیں۔ مگر شاہ جی کے آٹو گراف دینے سے تمام تر تنفر اور پہلو تہی کے باوجود بعض خوش قسمت عقیدت منداس سعادت کے حصول میں کامیاب ہوئے اور شاہ جی کے دست مبارک سے آٹو گراف لے کے ہی رہے۔

جنید احمد کے لیے آٹو گراف:

جنید احمد صاحب نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے 1990 میں مختلف علما اور ادیب حضرات کے آٹو گراف پر مشتمل ایک مجموعہ شائع کیا جس میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا قاری محمد طیب، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ جیسے اساطین علم وادب کے آٹو گراف شامل ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۳ پر شاہ جی کا آٹو گراف موجود ہے۔ تحریر فرماتے ہیں: "مخلوق میں جب تک خالق کا نظام نہیں چلایا جائے گا دنیا میں امن نہ ہوگا۔" سید عطاء اللہ بخاری ۲۸ دسمبر ۱۹۴۵ء بمبئی دفتر ہلال نو۔

شاہ جی ۱۹۴۶ء کی انتخابی مہم کے سلسلہ میں بمبئی کے دورے پر تھے حافظ علی بہادر مرحوم جو ہفت روزہ ''ہلال نو'' کے مدیر تھے، بمبئی سے احرار کے ٹکٹ پر انتخاب میں امیدوار تھے۔ جنید احمد نے یہ آٹو گراف ''ہلال نو'' کے دفتر میں شاہ جی سے لیا۔

محمد ایوب اولیا کے لیے آٹو گراف:

محمد ایوب اولیا اپنے ایک مضمون میں شاہ جی سے اپنی ملاقات کے احوال لکھتے ہوئے آٹو گراف لینے کے حوالے سے لکھتے ہیں: میں بھی آستانہ عالیہ پر جا پہنچا۔ شاہ جی نے کپڑے بدلے میرے پاس آٹو گراف البم تھا اور مجھے جستجو تھی کہ شاہ جی سے ہجوم کم ہو اور میں ان کا آٹو گراف حاصل کروں۔ میرے ساتھ میرے ایک عزیز دوست بھی تھے۔ بار بار جرأت کرتا مگر شاہ جی کا بارعب چہرہ دیکھ کر گھبرا جاتا۔ ایک صاحب کہنے لگے واہ جی! آپ کو شاہ جی کیوں آٹو گراف دینے لگے۔ انہوں نے تو شورش کو بھی آٹو گراف نہیں دیے۔ میں بھی چٹان کے سالگرہ نمبر میں بخاری صاحب کے فوٹو گراف کے سامنے استفہامیہ علامت (؟) دیکھ چکا تھا۔ (بعد میں شاہ جی نے شورش کاشمیری کو آٹو گراف دیتے ہوئے لکھا:

یہ کہہ رہے ہیں تجھ سے شہیدانِ راہِ عشق تو دل کا خون کر لے محبت کا خوں نہ کر

ماہنامہ نقیب ختم نبوت امیر شریعت نمبر حصہ دوم: ص ۲۱۹)

میں نے کہا ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس سے میری جرأت کو اور بھی ضعف پہنچا۔ گھر سے نکل چکا تھا۔ گوہرِ مقصود حاصل ہونے ہی والا تھا کہ آنجناب نے ٹانگ اڑائی اور مجھے دل برداشتہ کر دیا۔ میں بھی طے کر چکا تھا کہ اس شعر کے مصداق تو نہیں بنوں گا:

قسمت پہ اس مسافر بے کس کی روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

شاہ جی کے عقیدت مند پاؤں دبا رہے تھے۔ میں بھی ان کے پاس جا پہنچا اور شاہ جی سے آٹو گراف کے متعلق

کہا، کہنے لگے بھئی شعر میں لکھوا دیتا ہوں، لکھ لو نیچے میں دستخط کر دوں گا۔ میں نے کہا خود ہی شعر لکھیے اور دستخط بھی کیجیے۔ کہنے لگے: تھک گیا ہوں، اس لیے معذور ہوں۔ پاس ہی سائیں حیات اور امین گیلانی بیٹھے تھے۔ وہ مجھے کہنے لگے۔ لائیے ہم لکھ دیتے ہیں۔ شاہ جی سے صرف دستخط کروا لیجیے گا۔ میں اس پر بھی رضامند نہ ہوا۔ ایک صاحب کہنے لگے۔ شاہ جی کے دستِ مبارک سے شعر اور دستخط لینا چاہتے ہیں۔ میں نے فوراً کہا۔ نہیں صاحب! دستِ مبارک سے نہیں بلکہ دستِ خاص سے۔ شاہ جی اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے سن لیا بھئی! دستِ خاص سے لکھوانا ہے ان کو۔ اور پھر اس پر مسکرا دیے۔ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اپنے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف میں ایک شعر لکھ دیا جو نذرِ قارئین ہے:

یتیمِ مکہ محمد کہ آبروئے خدا است
کسے کہ خاکِ رہش نیست برسرش خاک است

(عطاء اللہ شاہ بخاری، ۲۸ فروری ۵۶ء۔ گوجرانوالہ)

ہفت اقلیم کی دولت مل چکی تھی، غنچۂ دل باغ باغ تھا، شاہ جی کا شکریہ ادا کیا، ساری کوفت دور ہوگئی۔ (نیرنگ نظر از محمد ایوب اولیا ص 61)

اکرام آصفی کے لیے آٹوگراف:

رازی پاکستانی شاہ جی کے عقیدت مندوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بھائی اکرام آصفی کی معیت میں ۱۰ اپریل ۱۹۵۶ کو شاہ جی سے ملتان شہر میں ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ اس دوران ان کے بھائی اور انہوں نے شاہ جی سے آٹوگراف لیے۔ رازی صاحب نے آٹوگراف لکھتے وقت شاہ جی کی روسی کیمرہ سے تصویر لی۔ یہی وہ تصویر ہے جس میں شاہ جی کچھ لکھتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ شاہ جی کی یہی تصویر اور آصفی کا آٹوگراف شورش کاشمیری نے اپنی کتاب ''سید عطاء اللہ شاہ بخاری...... سوانح و افکار'' کے پہلے ایڈیشن میں شائع کیے تھے۔ جناب رازی پاکستانی لکھتے ہیں:...... اس دن شاہ جی نے مجھے اور میرے بھائی اکرام آصفی کو بھی آٹوگراف دیئے تھے۔ اکرام کی آٹوگراف بک پر انہوں نے یہ شعر تحریر فرمایا کہ:

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے، کیا خوش مزاج ہے

(ماہنامہ نقیب ختم نبوت کا امیر شریعت نمبر حصہ دوم ص: ۳۴۰)

(شعر کے نیچے شاعر کا نام ''شاد عظیم آبادی'' اس کے بعد دستخط سید عطاء اللہ بخاری ۱۰ اپریل ۵۶ ملتان شہر تحریر ہے)

مختار مسعود کے لیے آٹوگراف:

مختار مسعود کی معروف زمانہ کتاب ''آوازِ دوست'' جو دو مضامین پر مشتمل ہے پہلا مضمون ''مینارِ پاکستان'' جبکہ

دوسرا مضمون ''قحط الرجال'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مضمون اس آٹوگراف بک کے گرد گھومتا ہے جو ۱۹۳۸ء میں مختار مسعود نے جب وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے اپنے والد کے مشورہ پر خریدی تھی۔ مختار مسعود نے ان تمام شخصیتوں کا نہایت دلچسپ پیرائے میں ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے آٹوگراف لیے، جن شخصیتوں کے انھوں نے آٹوگراف لئے ان میں قائداعظم، سروجنی نائڈو، مارشل ٹیٹو، خالدہ ادیب خانم، ملا واحدی، حسرت موہانی، ظفر علی خان، نواب بھوپال، راجہ صاحب محمود آباد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری نمایاں ہیں۔ مختار مسعود شاہ جی سے اپنی ملاقات کے احوال لکھتے ہوئے آٹوگراف لینے کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں: ''......میں نے موضوع بدل دیا اور اپنی آٹوگراف البم ان کے سامنے کر دی، شاہ جی نے اسے پہلو پر رکھا اور لکھا:

وہ اٹھتا ہوا اک دھواں اول اول
وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر
قیامت کا طوفان صحرا میں اول
غبارِ رہِ کارواں آخر آخر
چمن میں عنادل کا مسجود اول
اور گیاہِ رہِ گل رخاں آخر آخر

ان تین اشعار کے نیچے ایک طویل کش کے ساتھ سید لکھا اور سید کے اوپر عطاء اللہ بخاری لکھ کر دستخط مکمل کر دیئے۔ (آوازِ دوست ص:۱۵۴، از: مختار مسعود)

واضح رہے یہ اشعار شاہ جی کے ہیں جو انھوں نے اپنے مجموعہ کلام ''سواطع الالہام'' (اشاعت مارچ ۱۹۵۵ء) کی اشاعت کے بعد دورِ آخر میں کہے۔

مولانا محمد وسیم اسلم

# بطل حریت، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

ماضی قریب کی ایسی چند جلیل المرتبت شخصیات جو کسی بھی تعارف کی محتاج نہیں، ان میں ایک نمایاں شخصیت ایسے مردِ مجاہد، عاشق رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم، بطل حریت اور آزاد منش درویش کی ہے جس کے گھنگریالے بال، نورانی چہرہ، موٹی موٹی آنکھیں، کروڑوں انسانوں کے لیے سامانِ راحت، جو خطابت کے میدان میں آئے تو میدان ٹھاٹھیں مارتے سمندر کا منظر پیش کرے، کلام مجید کی تلاوت کرے تو لحن داؤدی کا رس سامعین کی سماعت میں بھر دے، جن کے قصوں کی تاریخ اٹھائیں تو تاریخ بھی رشک کرے۔ برِاعظم ایشاء کے بے مثل کھدر پوش خطیب جو حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ جنہیں متحدہ ہندوستان کی گلیوں، بازاروں، چوکوں میں یہ نعرہ مستانہ لگاتے بارہا سنا گیا کہ:

> ''ختم نبوت کی حفاظت میرا جز وایمان ہے جو شخص بھی اس ردا کو چوری کرے گا، جی نہیں چوری کا حوصلہ بھی کرے گا، میں اس کے گریبان کی دھجیاں بکھیر دوں گا۔ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کا نہیں۔ اپنا، نہ پرایا۔ میں اُنہی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہوں، وہی میرے ہیں۔ جن کے حسن و جمال کو خود ربِ کعبہ نے قسمیں کھا کھا کر آراستہ کیا ہو، میں انہی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حسن و جمال پر نہ مرمٹوں تو لعنت ہے مجھ پر اور لعنت ہے ان پر جو ان (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام تو لیتے ہیں، لیکن سارقوں کی خیرہ چشمی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔''

۲۳، فروری ۱۹۲۰ء میں مرزا بشیر الدین محمود کی بندے ماترم ہال امرتسر میں تقریر تھی۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے جلسے میں پہنچ کر اس سے چند ایک سوالات کیے جن کے جوابات اس سے نہ بن پائے اور بغیر جواب دیے وہاں سے بھاگ نکلا۔ بعد ازاں حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے ہال سے باہر آ کر مسلمانوں کے ایک بڑے ہجوم میں زوردار تقریر فرمائی۔ حضرت شاہ جی ۱۹۱۸ء میں باقاعدہ اس کام کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ ان دنوں تحریک خلافت عروج پر تھی۔ حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ بھی میدان میں آ گئے اور اپنی خطابت کی جولانیوں سے تحریک کو زمین سے اٹھا کر آسمانوں پر پہنچا دیا۔ شاہ جی پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور تین سال کی قید سخت میانوالی جیل میں رہے۔ پھر دوسری مرتبہ ۱۹۲۷ء میں مشہور دریدہ دہن آریہ سماجی راج پال کے قتل کے سلسلہ میں کافی عرصہ جیل میں رہنے کے بعد عدم ثبوت کی بنا پر رہا ہو گئے۔ تیسری مرتبہ نمک سازی کے قانون کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں ۱۹۳۰ء میں کلکتہ چھے ماہ کی قید ہوئی۔ چوتھی مرتبہ تحریک آزادی کشمیر کے سلسلہ میں دو سال کے لیے پھر جیل جانا پڑا۔ پانچویں مرتبہ قادیان میں نماز جمعہ پڑھا کر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کے الزام میں قید اور جرمانہ کی سزا ہوئی۔ پھر گرفتاریوں اور صعوبتوں کا سلسلہ تادم زیست

جاری رہا۔ پنجاب حکومت کے کارندوں نے ان پر بغاوت اور قتل عمد وغیرہ کے سنگین الزام لگا کر گرفتار کیا۔ مقدمہ چلا۔ چونکہ قدرت کو ابھی حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ سے اور کام لینے منظور تھے اس لیے چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ مسٹر جسٹس ڈگلس ینگ نے آپ کو بری کر دیا۔ پنجاب کے نواب زادے حیران و ششدر رہ گئے۔ پاکستان بن جانے کے بعد ۱۹۵۳ء میں دولتانہ وزارت کے زمانے میں تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں جیل گئے۔ زندگی کا طویل عرصہ جیل آپ کا مقدر رہی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ: ''میری آدھی عمر جیل میں گزری اور آدھی عمر ریل میں۔''

چار چیزیں حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھیں:

۱...... حضور خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے والہانہ عشق و محبت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کی حفاظت۔

۲...... اسلام پر مکمل ایمان اور اس کی تبلیغ و اشاعت۔

۳...... اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش۔

۴...... فرنگ دشمنی۔ اسی لئے فرمایا کرتے کہ ''میں انگریز کا باغی ہوں، میں ہندوستان سے انگریز کو نکال کر ہی رہوں گا۔''

بسا اوقات اپنے خطاب میں فرمایا کرتے کہ: ''مسلمانو! اگر میں اتنا قرآن پہاڑوں کو سناتا تو وہ بھی پگھل جاتے۔ افسوس کہ میری قوم کا دل موم نہ ہوا۔ اپنوں نے سنی ان سنی کر دی۔ مگر غیر ملکی حکمران فرنگی نے اس آواز کو سنا بھی اور سمجھا بھی۔'' فرنگی کو اسی پکار میں اپنے خلاف بغاوت کی بو آئی اور اسی جرم میں انہیں بہار و خزاں کے کئی موسم اسارت فرنگی میں گزارنے پڑے۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے ظاہری نتائج سے مایوس ہو کر کئی لوگ ان شہدائے ختم نبوت کے متعلق جو تحفظ ناموس ختم نبوت پر قربان ہو چکے تھے۔ یہ سوال کرتے تھے کہ ان کے خون کا ذمہ دار کون ہے؟۔

حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فیصل آباد کے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جواب میں ارشاد فرمایا: ''جو لوگ تحریک ختم نبوت میں جہاں جہاں شہید ہوئے ان کے خون کا جواب دہ میں ہوں۔ وہ عشق رسالت میں مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ان میں جذبۂ شہادت میں نے پھونکا تھا۔ جو لوگ ان کے خون سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں اور ہمارے ساتھ رہ کر اب کنی کترا (کنارہ کشی اختیار کر) رہے ہیں۔ ان سے کہتا ہوں کہ میں حشر کے دن بھی ان کے خون کا ذمہ دار ہوں گا۔ وہ عشق نبوت میں اسلامی سلطنت کے ہلاکو خانوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ لیکن ختم نبوت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی سات سو حفاظ قرآن صحابہ رضی اللہ عنھم اسی عقیدۂ ختم نبوت کے تحفظ کی خاطر شہید کروائے تھے۔''

حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے مزید فرمایا کہ قیامت کے دن حضور خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ گاہ میں حاضر ہو کر دست بستہ عرض کروں گا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں شہید ہونے والے خوش نصیبوں کا مقصد صرف اور صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم

نبوت کا تحفظ تھا۔ اسی طرح ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں شہید ہونے والوں کا مقصد بھی صرف اور صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا تحفظ تھا۔ یا رسول میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء میں شہید ہونے والوں کو بھی یمامہ کے شہدا کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا کریں۔ کیونکہ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا۔''

پھر حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''مجھے امید کامل ہے کہ میرے نانا، میرے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم میری درخواست کو شرف قبولیت ضرور بخشیں گے۔''

حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ ایک عظیم مجاہد تھے۔ انہوں نے اعلائے کلمۃ اللہ سے کبھی گریز نہیں کیا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن کبھی استقلال میں لغزش نہ آنے پائی۔ ان کا دل عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آماجگاہ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی گرفتاری نے انہیں تحریک تحفظ ختم نبوت کا جرنیل بنایا۔ اسی کو مقصد حیات اور زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے دنیا کے طوفانوں سے ٹکراتے ہوئے ۲۱ر اگست ۱۹۶۱ء کو دار فانی سے دار البقاء کی طرف رخصت ہوئے۔

بنت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ، سیدہ اُم کفیل بخاریؒ اپنی کتاب ''سیدی و ابی'' میں لکھتی ہیں کہ: ''ابا جی رحمۃ اللہ علیہ کی چند سانسیں باقی تھیں کہ اماں جی نے متوجہ کیا کہ دیکھو لوزبان ذکر کر رہی ہے۔ اللہ، اللہ، اللہ کا ورد جاری تھا۔ میں نے دیکھا کہ جس اللہ نے ان کو اقلیم خطابت کا یکتا تاجدار بنایا اور جس کی دی ہوئی قوت کو انہوں نے اس کے حبیب محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب ختم نبوت کے بیان میں ختم کر دیا۔ اسی اللہ کا نام لیتے ہوئے انہوں نے ایک دفعہ آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میرے پیارے ابا جان رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون! بڑے لوگ پہلے بھی ہوئے اور اللہ کو منظور ہے تو پھر بھی پیدا ہوتے رہیں گے۔ مگر ہم نے ابا جی رحمۃ اللہ علیہ جیسا کوئی نہیں دیکھا۔''

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

(سیدی و ابی، ص ۱۹۰)

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مجاہد ملت حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں اُن کی زیارت ہوئی۔ پوچھا حضرت شاہ جی فرمائیے: قبر کا معاملہ کیسا رہا؟ حضرت شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی یہ منزل بہت ہی مشکل ہے۔ لیکن آقائے نامدار خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے تحفظ کی برکت سے معافی مل گئی۔

یہ امت کے وہ محسن حضرات تھے جنہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس ختم نبوت کا تحفظ کیا اور آنے والی نسلوں کو سبق دیا کہ ہر چیز برداشت کی جا سکتی ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کسی قسم کا سمجھوتا قبول نہیں کیا جا سکتا۔ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً!

فیاض عادل فاروقی

# رہتا ہوں مدینے میں

گھر میرا ہے لندن میں، رہتا ہوں مدینے میں
رکھتا ہوں سدا الفت آقاؐ کی مَیں سینے میں

یوں دُور مدینے سے جینا بھی ہے کیا جینا
اب جی ہی نہیں لگتا یوں دور سے جینے میں

ہاں دُور تو ہوں لیکن، دل دُور نہیں انؐ سے
نگری ہے محمدﷺ کی، دل میرا یہ سینے میں

اس ایک حقیقت کے دو رُخ بھی حقیقت ہیں
دل میں بھی مدینہ ہے، دل بھی ہے مدینے میں

اس عشق کی دنیا کے اوقات نرالے ہیں
یا دِن کٹے ہفتے میں، یا سال مہینے میں

محبوبؐ کی یادیں ہیں، یادوں سے بھرا دل ہے
کیا مسکنِ الفت ہے، یہ دل جو ہے سینے میں

جس شان سے آپؐ آئے وہ شان ابھی تک ہے
وہ شان مدینے کی اب تک ہے مدینے میں

ہے عطر کوئی ایسا، نہ ہی مشک، نہ عنبر ہے
جنت کی ہی خوشبو ہے آقاؐ کے پسینے میں

ثانی ہی نہ تھا جس کا، ہو گا، نہ کہیں پر ہے
آپؐ ایسا نگینہ ہیں مولا کے خزینے میں

اب پیرویٔ سنت ہی نوحؑ کی کشتی ہے
طوفاں میں گھرے لوگو! آ جاؤ سفینے میں

اصحابؓ پیمبرؐ سب ساتھی ہیں ہمیشہ کے
صدیقؓ، عُمرؓ، عثماںؓ ہیں ساتھ مدینے میں

آلام میں صابر ہے، انعام پہ شاکر ہے
عُشاق کا دل عادلؔ رہتا ہے قرینے میں

علامہ عبدالرشید نسیم طالوت رحمہ اللہ

# شرابی رہبر

پوچھو نہ مجھ سے اس کی خرابی　جس قوم کے ہوں رہبر شرابی
اک ہاتھ میں ہے مفتی کا فتویٰ　اک ہاتھ میں ہے ساغر گلابی
معجون بھی ہے الہام بھی ہے　پیری کو آئی وحیِ شتابی
سنتے نہیں وہ اب بات میری　لے ڈوبی مجھ کو حاضر جوابی
بچتے ہیں اب تو ہر جعفری سے　اللہ ان کی عصمت مآبی
جامِ پلومر پھر ہاتھ میں ہے　چندوں میں ہوگی پھر بے حسابی
اپنا رہے ہیں ہر گندگی کو　رکھتے ہیں گویا وصف ذبابی
تقلید سے ہیں جو دور کوسوں　کہتے ہیں مجھ کو وہ بھی وہابی
دل میں ہے میرے عشق ان کا نافذ　شاہد ہیں جس پر اشک ِصنابی

☆......☆......☆

حبیب الرحمٰن بٹالوی

# غزل

اک بے وفا سے وفا چاہتا ہوں　''میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں''
نفرت میں سب کچھ روا ہوتا ہوگا　محبت میں صدق وصفا چاہتا ہوں
اذاں میں کہاں وہ روح بلالی!　اذانواں میں کیف صدا چاہتا ہوں
لفظوں کی ترتیب، شعروں کی بندش　میں حرفوں میں حُسنِ ادا چاہتا ہوں
بالوں میں چاندی اُترنے سے پہلے　بر دستِ دختر حنا چاہتا ہوں
گلشن میں، بن میں، کوہ و دمن میں　میں بادِ نسیم و صبا چاہتا ہوں

کھری بات کرنے کا عادی ہوں پیارے
''بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں''

مولانا سید محمد عبدالرب صوفی رحمہ اللہ

# کالج کے اثرات

اب نہ تھم اے اشک غم، اے چشم نم جی بھر کے رو
قوم کی پونجی لٹے جب اشک جاری کیوں نہو

کالجوں میں جاکے اُف مومن کی پونجی لٹ گئی
رنج سے اور شرم سے رو اور اسکے غم سے رو

جاکے کالج میں میاں جو تھے وہ مسٹر ہوگئے
غیر کی صورت بنے خود اپنی دی لٹیا ڈبو

کٹ گئی داڑھی، اُگی البرٹ لٹکے پائنچے
جاکے کالج ہائے رکھدی دین کی پونجی گرو

فیشن انگریزی بھی ہے انگریز کے دشمن بھی ہیں
دشمن انگریز آخر کوئی ایسا بھی تو ہو

ذہنیت یہ ہے کہ اسکی وضع آئی ہے پسند
اور ہٹ دھرمی سے کہتے ہیں عدو انگریز کو

پائجامہ بن گیا نیکر اوٹنگا آپ کا
آپ نے پنشن عطا کردی ازار شرع کو

آپ کی اچکن تو کالج جا کے چسٹر بن گئی
ہائے جاکر اب کہاں دیکھیں مسلماں شکل کو

جاکے تھیٹر دیکھتے ہو اُف انھی آنکھوں سے تم
جن سے پڑھتے تھے کبھی تم خود کلام اللہ کو

ہائے تم بھیجے گئے اسکول وکالج کس لیے
تھیں بہت کچھ تم سے امیدیں بھی مسلم قوم کو

اس لیے تحصیل انگریزی کی حاجت تھی کہ تم
دین کی تبلیغ جاکر مسٹروں میں کرسکو

ہائے وہ بدبخت ساعت جبکہ تم کالج گئے
نفع کیسا؟ گانٹھ کی پونجی بھی دی تم نے ڈبو

ہم یہ سمجھے تھے کہ تم سے غیر بھی سیکھیں گے دیں
تم تو اپنا دین بھی کالج میں جاکر آئے کھو

خود مسلماں ہوکے غیروں کی غلامی تم نے کی
کس قدر کمزور ہو سوچو ذرا اے دوستو

کر کے ہمت مردہ بالوں کو کٹا دو دین پر
وقت پر شہ رگ کٹانے کے لیے تیار ہو

دیکھ کر صورت تمھاری لوگ سمجھیں اُمتی
سنّت پاک نبیؐ روشن تمھارے رخ پہ ہو

فرط دل سوزی سے ہے یہ نظم صوفیؔ نے لکھی
ظاہر وباطن سے بن جاؤ مسلماں دوستو

پروفیسر میاں محمد افضل ساہیوال

# صفیہ بی بی کو بنا دے اے خدا جنت مکیں

صفیہ بی بی (۱) ہوگئی ہے عازم خلدِ بریں　باپ اور تایا کے پہلو میں ہوئی ہے، جاگزیں
تیرے داد مولوی صالح تھے، عالم بے بدل　حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں تھے، مردِ ذہیں
خانداں سارا جدائی میں تری، بد حال ہے　اہلِ دل جانے سے تیرے غم زدہ ہیں، بالیقیں
زندگی ساری گذاری خدمتِ قرآن میں　صالحہ و عابدہ تجھ سی نہیں دیکھی، کہیں
ساری تلمیذات (۲) تیری، اس لیے نم دیدہ (۳) ہیں　تیرے جیسی مونسہ (۴)، اُن کو کہیں ملتی، نہیں
خاندان رائے پور سے، تیری نسبت تھی کڑی　رائے پور والے سبھی اب ہو گئے، اندوہگیں
پیر جی عبدالجلیل و پیر جی عبدالحفیظ (۵)　بھائی تیرے، موت سے تیری ہوئے، بے حد غمیں
قاری صاحب (۶)، تیرے شوہر دل گرفتہ ہو گئے　صبر دے اُس کو خدایا، وہ ہوئے، بے حد حزیں
اے خدا ہم سب کو دولت صبر کی کر دے عطا　تُو ہی مالک، دینے والا، تُو ہی، ارحم راحمیں
اُس کے روحانی برادر، افضلؔ خستہ کی سُن　صفیہ بی بی کو بنا دے اے خدا، جنت مکیں (۷)

(۱) یہ خاتون پیر جی عبداللطیفؒ چیچہ وطنی والوں کی بیٹی۔ ان کے تایا مولانا عبدالعزیزؒ چک ۱۱[۱۱۱یل] والے تھے، دونوں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمہ اللہ کے بڑے خلفاء میں شامل تھے

(۲) شاگرد بچیاں (۳) رو رہی ہیں (۴) محبت کرنے والی (۵) یہ دونوں مرحومہ کے بڑے بھائی ہیں

(۶) مرحومہ کے خاوند کا نام قاری شبیر احمد ہے، مدرسہ عزیزیہ فضلیہ کے مہتمم ہیں (۷) جنت میں رہنے والی

(۸ جولائی ۲۰۲۰ھ)

سید عدنان کریمی

# مفتی محمد نعیم رحمہ اللہ سے ایک ایک یادگار انٹرویو

فیس بک فرینڈ زلسٹ میں ''سرچ کی دنیا'' کے نام سے ایک گمنام، خاموش قاری ہوتے تھے، وال پر کسی قسم کی کوئی ایکٹیویٹی نہیں تھی، البتہ میسینجر پر راہ ورسم رکھتے تھے، کبھی اقوالِ زرّیں اور کبھی اپنی تصاویر بھیجا کرتے، بندہ جانا پہچانا سا لگتا تھا لیکن نام معلوم نہ تھا۔ ایک دن خاکسار نے اُن کا نام اور تعارف پوچھنے کی جسارت کی، بس پھر اُس دن سے تعلقات مزید پختہ ہو گئے۔ جامعہ بنوریہ العالمیہ کی ختم بخاری سے ایک روز قبل خاکسار نے اُنہیں پیغام بھیجا کہ مجھے مفتی محمد نعیم صاحب سے ملاقات کرنی ہے، کوئی ترتیب بنا دیجیے، انہوں نے جھٹ سے جواب دیا چونکہ کل ختمِ بخاری کی تقریب ہے، لہٰذا آپ پرسوں آجایئے اور ملاقات کا موضوع کیا ہے؟ جواباً عرض کیا کہ کوئی خاص ایجنڈا تو نہیں البتہ ایک غیر رسمی سا انٹرویو کرنا ہے۔ مقررہ تاریخ کو صبح اُنہیں فون کر کے تصدیق چاہی کہ آج آسکتا ہوں؟ انہوں نے کہا کہ ضرور آئیں بلکہ ظہر کی نماز جامعہ میں ادا کریں پھر ملاقات کروا دیں گے۔

نمازِ ظہر کی ادائیگی کے بعد مفتی محمد نعیم صاحب نظر آئے اور نہ ہی ہمارے وہ سہولت کار کرم فرما۔ دل بے ایمان ہونے لگا، وسوسے کلبلانے لگے، مبادا سیکریٹریز کے چکر میں یہ ملاقات بھی کھٹائی میں نہ پڑ جائے، فون نکالا تو دھوپ کی روشنی میں فون اندھا، جوتے اٹھائے تو وہ گرم، دماغ تو پہلے سے ہی مائل بہ حرارت تھا۔ چھاؤں میں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر نظریں گھماتے ہوئے مجھے ہر فلپائنی اور انڈونیشین طالب علم میں مفتی صاحب کا عکس نظر آنے لگا، لیکن عکس کا وجود غائب۔ اپنے کرم فرما سے رابطہ بحال کیا تو معلوم ہوا کہ جامعہ بنوریہ کے اندر دو مساجد ہیں، ایک بڑی اور دوسری چھوٹی۔ انہوں نے استفسار کیا کہ آپ کونسی مسجد میں ہیں؟ میں نے کہا کہ "بابِ نعیم" سے داخل ہوتے ہی جو مسجد ہے، وہاں کھڑا ہوں، کہنے لگے اپنی ناک کے سیدھ میں آگے آتے جایئے، ایک عمارت نظر آئے گی، اس میں داخل ہو جائیں اور چھوٹی مسجد کے ساتھ بہت سارے دفاتر ہیں، اُنہی دفاتر میں سے ایک مفتی نعیم صاحب کا دفتر ہے، میں وہاں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔

چند منٹ کے فاصلے کو قدموں سے طے کرتے ہوئے عمارت اور پھر دفتر پہنچا تو دیکھا مفتی سیف اللہ ربانی صاحب تشریف رکھتے ہیں، سلام علیک کے بعد کہنے لگے کہ آپ بالکل بروقت پہنچے، تھوڑی دیر میں مفتی صاحب آتے ہیں تو ملاقات ہو جاتی ہے۔ گفتگو اور احوالِ زمانہ پر بے موسم تبصرے جاری تھے کہ اس دوران آستین چڑھائے مفتی نعیم صاحب سامنے سے آتے دکھائی دیے، دفتر میں داخل ہوتے ہی سب کو باآواز بلند سلام کیا اور دفتر کے اندر بنے اپنے مخصوص دفتر میں چلے گئے۔

چند ہی لمحوں میں ملاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا، کوئی اپنے نجی معاملات لا رہا ہے تو کوئی اپنی مسجد کمیٹی کے دکھڑے

سنا رہا ہے، کوئی اپنے تھانہ کے ایس ایچ او سے پریشان ہے تو کوئی دینی معاملات میں شرعی آگہی کا خواہشمند ہے، کوئی اسلام قبول کرنے کے لیے آ رہا ہے تو کوئی مالی معاونت چاہتا ہے۔ غرض یہ کہ تمام لوگوں سے باری باری ملاقات ہوتی ہے، مسائل سُنے جاتے ہیں اور حتی الامکان اُسے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چائے پینے کے بعد مولانا ربانی اٹھے اور مجھے کہا کہ آیئے چلتے ہیں، مفتی نعیم صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو الگ ہی دنیا تھی، ہر چیز سلیقہ اور قرینے سے رکھی گئی تھی۔ کمرہ کے چاروں طرف اسکرین اور اسکرین پر جامعہ کے تمام نقل وحرکات کو مانیٹر کیا جا رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً مفتی صاحب اسکرینز پر طائرانہ نگاہ ڈالتے اور پھر اپنے کام میں جُت جاتے۔

موصوف ربانی صاحب نے خاکسار کا تعارف کروایا تو مفتی صاحب چشمہ کے پیچھے سے گھورنے لگے۔ اُن کے گھورنے سے اوسان تو خطا نہیں ہوئے تاہم ہمت منتشر ہونے لگی تھی کہ یکا یک مفتی صاحب کی آواز گونجی: جی صاحب! فرمایئے کیسے آنا ہوا؟ ہم نے اپنا مدعا بیان کیا نیز انٹرویو کی بابت اُن کی اجازت کے لیے تمہید اِن الفاظ میں باندھنی پڑی:

حضرت! آپ میرے اساتذہ کے استاذ ہیں، میرے اُستاذوں میں سے کسی نے آپ سے شرح وقایہ اور شرح تہذیب پڑھی ہے تو کسی نے مقامات اور ہدایہ۔ گویا آپ میرے دادا استاد ہوئے، میرے سوالات کچھ عجیب سے ہوتے ہیں، اگر اُنہیں اوٹ پٹانگ کہہ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں تاہم ان سوالات سے آپ کی توہین اور تنقیص قطعی مقصود نہیں بلکہ آپ اور آپ کے جامعہ سے متعلق پھیلائی جانے والی باتوں کی حقیقت جاننا ہے۔ امید ہے کہ آپ محسوس نہیں کریں گے بلکہ ذرہ نوازی فرماتے ہوئے جواب عنایت فرمائیں گے۔ میری خطبہ نما تمہید ختم ہوئی تو وہ مسکرا دیے، کہا، بڑے سمجھدار لگتے ہو، کہاں کے فاضل ہو؟ خاکسار نے اپنی مادرِ علمی اور سن فراغت سے متعلق آگاہ کیا تو اُن کی آنکھوں میں گویا چمک اتر آئی۔ بولے: جی شروع کریں، آپ کا وقت شروع ہوتا ہے۔ اب کی بار مختصر سا انٹرویو ہو جائے تو اچھا ہے کیونکہ تھوڑی دیر میں ایک میٹینگ کے لیے نکلنا ہے، بعد میں پھر کبھی تفصیلی انٹرویو قلمبند کر لیجیے گا۔ بندہ نے سرِ تسلیم خم کیے بنا سر کو صرف ذرا سا جنبش دیا تو سامنے لگی گھڑی کی سوئیاں سرعت سے یہاں وہاں سرپٹ دوڑنے لگیں۔

مفتی صاحب! شنید ہے کہ آپ مولویوں کے الطاف حسین ہیں۔ کورٹ کچہری، تھانہ، میڈیا، بدمعاشوں اور مافیاز کو قابو کرنے کے لیے آپ کے پاس کونسی ایسی جادو کی چھڑی ہے کہ آپ جس پر پھیرتے ہیں وہ رام ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس دوران مفتی صاحب کے زوردار قہقہہ نے خاکسار کے سوال کو نکتۂ تکمیل پر پہنچنے سے پہلے ہی ائیر کنڈیشنڈ کی مصنوعی ہواؤں اور ٹھنڈک میں اڑا دیا۔ ہنسنے کے بعد چشمہ اتار کر ایک طرف پھینکا، آنکھوں کو مَلتے ہوئے بولے کہ یہ سوال تو آپ کا صحافیانہ اختراع ہے۔ اللہ معاف فرمائے، ہمیں ایسے شخص سے نہ ملایئے جو ملک وملت کا دشمن اور ریاست کا غدار ہو۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ ہم نے ہر کسی سے مضبوط روابط اور اچھے تعلقات بنا رکھے ہیں جس کی بنا پر ہر کوئی ہماری سنتا ہے اور ہم کسی کی سُنتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ہمارے اچھے تعلقات ہی جادو کی چھڑی ہے۔

اچھا مفتی صاحب! یہ دوسرا سوال نہیں بلکہ پہلے سوال ہی کا تتمہ ہے، کیونکہ میرا سوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے ایسا کوئی مولوی یا مہتمم نہیں دیکھا کہ جسے ہر نیا آنے والا آئی جی (انسپکٹر جنرل پولیس) فون کر کے نیک تمناؤں کا اظہار کرے اور تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا رہے۔ سنا ہے کہ آج کل میں آنے والے نئے آئی جی صاحب کی آپ سے نہیں بنتی، کیا یہ حقیقت ہے؟ دوسری بات یہ کہ ہمیں باہر چائے پیتے پتا چلا کہ کسی مسجد کمیٹی کو تھانہ ایس ایچ او نے زچ کر رکھا تھا، ملاقاتیوں میں سے کسی ایک نے ابھی آپ کو شکایت دی اور آپ نے فوراً ڈی جی آئی کو فون کر کے اُس کی معطّلی کے بارے میں بات کی اور آپ کو گرین سگنل بھی مل گیا۔ کیا یہ سب سچ ہے؟

سامنے رکھے مکتب پر اپنی کہنیاں ٹکاتے ہوئے گویا ہوئے: جی بالکل ایسا ہی ہے، نئے آنے والے آئی جی صاحب سے اُن کے پچھلے دور میں مدارس اور طلبہ کے ایشو پران بن ہوئی تھی، لیکن اب وہ جھگڑا ختم ہو گیا ہے، موصوف نے کل مجھے کال کر کے دینی مدارس وقیادت کے لیے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی کہا کہ بہت جلد جامعہ کا دورہ بھی کروں گا۔ رہا وہ کوئی گراؤنڈ والی مسجد اوران کے تھانہ کا معاملہ، تو ڈی آئی جی صاحب ہمارے اچھے دوست ہیں، بڑی گپ شپ ہے، ایسے چھوٹے موٹے قصے تو معمول کی بات ہے۔

حضرت! آپ بنوری ٹاؤن کے ہونہار فاضل اور مدرس تھے، کیا وجہ بنی کہ آپ بالکل الگ تھلگ ہو کر شہر کے ایک کونے میں آ بسے اور اپنے جامعہ کا نام بھی حضرت بنوری کے نام سے موسوم کیا۔ سنا ہے کہ یہ سب آپس کے کسی اندرونی اختلافات کا نتیجہ تھا۔ میرے دوسرے سوال پر ایک گونہ تنک گئے، کہنے لگے کہ لگتا ہے آپ کی "شنید" اور آپ کا "سننا" دونوں شریر قسم کے بھائی بہن ہیں۔ میں اس قسم کی جھوٹی باتوں کی سختی سے تردید کرتا ہوں۔ جھوٹوں پر خدا کی مار پڑے، ہمارے کوئی اندرونی اختلافات نہیں تھے، بلکہ والد صاحب کو یہاں یہ جگہ مل رہی تھی تو حضرت مفتی احمد الرحمٰن صاحب کی مکمل مشاورت اوران کی تائید سے اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا، مزید یہ کہ ادارہ کا نام اوراس کا افتتاح بھی حضرت نے کیا، پھر اگلے روز وہ انتقال کر گئے۔ بنوری ٹاؤن میری مادرِ علمی ہے، میں اس سے بے وفائی کا سوچ بھی نہیں سکتا، وہاں میرا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آپ بے فکر رہیے، یہ سب افواہیں اور بغض کا شاخسانہ ہے۔

اس دوران فون کی گھنٹی بجی تو مفتی صاحب کال میں مصروف ہو گئے اور بندہ اپنے سوالات کے نوک پلک سنوارنے میں لگا رہا۔ فون سے فارغ ہوتے ہی استفسار کیا کہ آپ ایک منجھے ہوئے استاد اور کہنہ مشق مفتی ہیں، کیا وجہ ہے کہ آج کل آپ نے تدریس سے کنارہ کر رکھا ہے۔

بڑے پیار سے بولے: بیٹا! آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے تدریس سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی ہے؟ مصروفیات کی وجہ سے تدریس کو اگرچہ کم وقت مل رہا ہے تاہم پابندی کے ساتھ تدریس جاری ہے۔ بخاری شریف میں مغازی سالہا سال سے میرے پاس ہے۔ تدریس اور میرا رشتہ گویا روح اور جسم کا رشتہ ہے۔ اگر جسم سے روح نکال دی

جائے تو جسم بیکار، اسی طرح اگر مجھ سے کلیتاً تدریس کی ذمہ داریاں لے لی جائیں تو میرا بھی کوئی فائدہ نہیں۔

قبلہ! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ غیر محسوس طریقے سے صرف برسراقتدار جماعت کے ہی قریب رہتے ہیں، کسی زمانہ میں ایم کیوایم سے آپ کی قربت تھی، آج کل حکمران جماعت تحریک انصاف آپ کی منظورِنظر ہے۔ کیا یہ حقیقت ہے یا یہ بھی لوگوں کی نظروں کا دھوکا ہے؟ سامنے لگی اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے کہنے لگے: ہماری تو تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں سے سلام دعا رہتی ہے البتہ متحدہ کے ساتھ پہلے بھی قربت تھی اب بھی قربت ہے لیکن ایم کیوایم پاکستان کے ساتھ۔ حالانکہ ایم کیوایم آج سب سے زیادہ مطعون جماعت سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح حکمران جماعت سے بھی صرف مدارس کے ایجنڈے، مدارس کے معاملات اور غیر ملکی طلبہ کے ایشوز پر تعاون جاری رکھنے تک اتحاد ہے۔ ابھی گزشتہ روز ختم بخاری کی تقریب میں گورنر سندھ عمران اسماعیل صاحب آئے تھے، میں نے ان کے اچھے اقدامات پر ان کی تعریف کی اور بعض امور پر ان سے برملا شکوہ بھی کیا۔

مفتی صاحب! آخری دو سوالات کے بعد اجازت چاہوں گا۔ کہتے ہیں کہ مضاربہ اسکینڈل کو آپ کا مکمل سپورٹ حاصل رہا ہے، آپ ان تمام بدنہاد کرداروں کی پشت پناہی کرتے رہے ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو کہ آپ نے اپنے پورے ادارہ کو بھی اس کام میں مصروف رکھا تھا۔ اس بات میں کتنی صداقت ہے؟

بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگے کہ یہ سراسر بہتان ہے کہ میں مضاربہ اسکینڈل کے پیچھے تھا یا ان کو میری معاونت حاصل تھی۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ میں نے خود اپنے پیسے لگائے اور اپنے جاننے والوں کے پیسے لگائے لیکن کسی کو ترغیب دی اور نہ ہی کسی کو اکسایا۔ اب دیکھیے نا وہ بندہ فرار ہے لیکن ہم سکون سے بیٹھے ہیں کہ تمام ادارے جانتے ہیں کہ ہمارا اس میں کوئی کردار نہیں تھا۔ مفتی صاحب کی بات کاٹتے ہوئے میں بول پڑا کہ کیا یہ اتنی سادہ سی بات ہے جتنی سادگی سے آپ بیان کررہے ہیں؟ لاحول پڑھ کر کہا: اور نہیں تو کیا میں اس کے لیے قسم اٹھاؤں؟؟

حضرت! آخری سوال ہے، میں نے اپنی زندگی میں صرف دو بندوں کو کھلے گریبان اور آستین چڑھائے ہوئے چلتے دیکھا۔ ایک ایس پی چودھری اسلم اور دوسرے آپ۔ آپ کو شروع سے ایک ہی حالت میں، ایک جیسے کپڑے اور ایک جیسے اسٹائل میں دیکھا۔ کیا وجہ ہے کہ آپ کا لباس کے حوالہ سے وہ کروفر نہیں جو دیگر مذہبی رہنماؤں کا دیکھنے میں آتا ہے۔ ٹشو پیپر کے تین چار ڈبے سامنے موجود ہونے کے باوجود جیب سے رومال نکالا، چہرہ صاف کیا اور ساتھ رکھے زیتون کے تیل کی بوتل سے ہلکا سے تیل ہاتھوں میں لیا اور چہرے پر ملتے ہوئے گویا ہوئے: بچپن سے والد صاحب نے لباس سے متعلق تکلف و تصنع سے دور رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ مجھے دیکھیں گے کہ کسی بھی قسم کا کوئی بھی اجتماع یا تقریب ہو، میں آپ کو ایک ہی حلیہ میں نظر آؤں گا اور یہ انداز اب مجھے پرسکون لگتا ہے۔ (مطبوعہ دلیل ڈاٹ پی کے)

خالد محمود۔ کراچی

# فرقہ فرقہ کھیلنے کا قادیانی ڈرامہ

پہلے بھی کئی بار عرض کیا جاچکا ہے، کہ قادیانی ٹولے کے دو فیورٹ موضوع ہوا کرتے ہیں، اول ''حیات و وفات عیسیٰ علیہ السلام'' اور دوم ''نبوت جاری ہے''۔ کچھ عرصہ سے قادیانی ٹولے نے اول موضوع حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ''رفع و نزول'' کی گفتگو سے راہ فرار کا یہ رستہ اختیار کیا ہوا کہ اب اس موضوع کی گفتگو سے پہلے مسلمانوں سے ان کے فرقہ یا مکتبہ فکر کا پوچھتے ہیں۔ حالانکہ ایسے تمام سوالات جو ۱۹۷۴ کی کاروائی کے دوران قادیانی ٹولے کے اس وقت کے سربراہ مرزا ناصر احمد نے مسلمانوں کے مختلف مکتبہ فکر کے لوگوں کے بارے میں اسمبلی میں اٹھائے تھے، ان کے مفصل جوابات دے دیے گئے تھے۔ پھر یہ کہ خود مرزا قادیانی نے اپنا مکتبہ فکر یا فرقہ ۲۳ /اکتوبر ۱۸۱۹ کو جامع مسجد دہلی میں بیان دیتے ہوئے بتایا کہ: ''ان تمام امور میں میرا وہی مذہب ہے جو دیگر اہل سنت و جماعت کا ہے''۔ (مندرجہ تبلیغ رسالت حصہ دوم، ص، 24)

رہی فرقہ کی بات تو اس میں بھی مرزا قادیانی کا بیان ریکارڈ پر موجود ہے، کہ: ''چونکہ مسلمانوں کا ایک نیا فرقہ جس کا پیشوا اور امام اور پیر یہ راقم ہے......'' (کتاب البریہ، روحانی خزائن، 13، 337)

پھر مرزا قادیانی بڑی شد و مد سے کہتا ہے، کہ: ''میں زور سے کہتا ہوں اور میں دعوے سے گورنمنٹ کی خدمت میں اعلان دیتا ہوں کہ باعتبار مذہبی اصول کے مسلمانوں کے تمام فرقوں میں سے گورنمنٹ کا اول درجہ وفادار اور جانثار یہی نیا فرقہ ہے۔'' (کتاب البریہ، روحانی خزائن، 13-343)

یاد رہے کہ یہ وہ خطوط ہیں، جو مرزا قادیانی نے اپنے نئے فرقے (قادیانی فرقہ) کے سلسلہ میں اپنی وفاداری جتانے کے لیے اس وقت کی گورنمنٹ انگریزی کو لکھے تھے، جن کے لئے مرزا قادیانی اپنے وجود کو اس گورنمنٹ کا خود کاشتہ پودا کہا کرتا تھا۔ پھر یہ کہ قادیانی ٹولے کے لئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے، کہ ان کے یہاں تو خود 13 و 14 فرقے بن چکے ہیں، نیز یہ کہ مسلمانوں سے ان کا فرقہ یا مکتبہ فکر پوچھنے والے اس قادیانی ٹولے کو تو 1974 کی کاروائی میں مسلمانوں کے تمام مکتبہ فکر نے متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیا ہے، *تو ایسی صورت میں قادیانی ٹولے کو مسلمانوں کے فرقہ یا مکتبہ فکر سے زیادہ اپنے ٹولے یا فرقہ ہونے کی فکر کرنی چاہیے۔

اس کے علاوہ یہ کہ اہل اسلام کو تہتر، چوہتر فرقوں کا طعنہ دینے والا قادیانی ٹولے کیا یہ بتانا پسند کرے گا، کہ ان تہتر، چوہتر فرقوں میں خود قادیانی ٹولے کس نمبر پر ہے۔؟۔ جبکہ اصل حقیقت یہی ہے کہ قادیانیت علمی طور پر ہر محاذ پر اہل اسلام سے شکست کھا چکی ہے، اور اب اسی شکست کو چھپانے کے لئے قادیانی ٹولے نے مسلمانوں سے فرقہ فرقہ کھیلنے کا ڈرامہ رچا ہوا ہے۔

---

مؤلف: مفکراحرار چودھری افضل حق رحمہ اللہ اشارات: مولانا عبیداللہ احرار رحمہ اللہ

# تاریخ احرار

(چوتھی قسط)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمدہٗ ونُصَلّیِ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الکَرِیۡم

اشارات:

مغلیہ بادشاہ اکبر، ہمایوں کے گھر میں اس وقت پیدا ہوا۔ جبکہ شیر شاہ سوری اس کے تعاقب میں تھا وہ بیچارہ صحراؤں، دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا تھا اس مسلسل بے چینی کی وجہ سے ہمایوں، اکبر کی تعلیم وتربیت کا کوئی بندوبست نہ کر سکا اس طرح یہ ذہین وفطین شہنشاہ ہر قسم کے علوم وفنون سے بالکل بے بہرہ رہا۔ اکبر نے اپنے دور حکومت میں نہ صرف اپنی سلطنت اور قلم رو کو وسیع کیا بلکہ سیاسی مصالح کی بناء پر ہندوؤں کو بہت زیادہ مراعات دیں اور اپنی حرم سرا میں ہندو بیگمات کو داخل کر لیا۔ یہیں سے اس کے دربار وسرکار میں الحاد اور بے دینی کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس بے دینی کی رہی سہی کسر ابوالفضل اور فیضی کی ملحدانہ سرگرمیوں نے پوری کر دی۔ ان کی زندیقیت آخر میں اکبر کے دین الٰہی کا روپ دھار گئی۔ اکبر کا الحاد روز بروز فروغ پذیر ہوتا رہا۔ اسے حکومت کی سرپرستی نے اسلامیان ہند کے لیے ایک عظیم فتنہ کی صورت پیدا کر دی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی دربار میں سجدۂ تعظیمی لازم قرار دیا گیا، اکبر کو معصوم اور دین الٰہی کا بانی ثابت کیا گیا، محمد اور احمد کے نام پر بچوں کا نام رکھنا ممنوع قرار دیا گیا، ہندوؤں کی رعایت سے ذبیحۂ گاؤ حکماً بند کر دیا گیا، ختنہ ایسے مسنون فعل کو جرم گردانا گیا......غرض اس قسم کی بے شمار خرافات، بدعات، سیئات، منکرات اور فواحش کو سرکاری سرپرستی میں پھیلایا گیا۔ اس قسم کی جتنی بھی نامعقول حرکات کی گئیں ابوالفضل اور فیضی کی بارگاہ سے انھیں سند جواز مہیا کی گئی۔ ابوالفضل اور فیضی نے اپنے گھٹیا عقائد کے لیے ہمیشہ اکبر کے مذموم افعال کو دلیل بنانے کی ناکام کوشش کی۔ یہ فتنہ اس حد تک پھیلا کہ شیخ عبدالحق، محدث دہلوی مرحوم ایسے یگانہ روزگار اشخاص نے بھی سکوت اور عزلت گزینی میں ہی مصلحت سمجھی، لیکن ہر فرعونے را موسیٰ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دین کی تجدید واحیاء کے لیے محبوب سبحانی، مجدد الف ثانی، حضرت شیخ احمد سرہندی فاروقی رحمتہ اللہ علیہ کو پیدا فرمایا۔ حضرت شیخ سرہندی کا علم تقویٰ، خلوص، للّٰہیت، حق گوئی، حق پسندی، جذبۂ اتباعِ سنت، استقلال، استقامت، دعوت، عزیمت اور مخلصانہ مساعی جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں رنگ لائیں۔ یوں خدا تعالیٰ نے دین حنیف اور ملت بیضاء کی حفاظت وصیانت اور تحفظ ودفاع کے سامان مہیا فرمائے۔

حضرت سلطان اورنگ زیب عالم گیر رحمتہ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے زوال کے آثار بالکل نمایاں ہو چکے تھے جنوبی اور مشرقی ہند کی طرف سے انگریز اپنی پوری ڈپلومیسی کے ساتھ ایک تاجر کے بھیس میں نہ صرف ہندوستان میں ڈیرے لگا چکا تھا بلکہ پلاسی اور سرنگا پٹم کے میدانوں میں اپنے جعفرو

صادق اور ان کے زلہ خواروں کی غداری وملت فروشی کی بدولت شیر بنگال سراج الدولہ اور مجاہد دکن ٹیپو سلطان کو جام شہادت نوش کرانے کے خوف ناک قاتلانہ منصوبہ کی تکمیل کر چکا تھا۔ مسلسل اور بے راہ روحکم رانی کی وجہ سے مسلمانوں کے علمی وفکری قویٰ مضمحل ہو چکے تھے ان کے علمی اور فکری سوتے خشک ہو چکے تھے جمود وجہالت اور رافضیت وبدعت پرستی ان کے ایوانِ علم وعمل میں دھرنا مار کر بیٹھ چکی تھیں ان کی سیاسی صفوں میں نہ صرف بحرانی کیفیت رونما ہو چکی تھی بلکہ وہ شدید انتشار کی نذر ہو چکے تھے نتیجۂ مغلیہ اقتدار چراغ سحری کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔

اس یاس وقنوط کے عالم میں ہندوستان کی راج دھانی دہلی سے خاندان فاروقی کے گل سرسبد حضرت شاہ عبدالرحیم کے لختِ جگر امام الہند حجتہ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ گمنامی کی صفوں سے اٹھے اپنی خداداد قابلیت، لیاقت، ذہانت، فطانت، علم، ریاضت اور تصنیفات کی بدولت شہرت کے آسمان پر پہنچے۔ حضرت شاہ ولی اللہ مرحوم نے خوب اچھی طرح یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اب شدید سیاسی بحران اور سیاسی انتشار میں مبتلا ہو چکے ہیں ان کی وحدت ومرکزیت ختم ہو چکی ہے مغلیہ دورِ حکومت کا آفتاب ڈھل چکا ہے ان کا اقتدار چراغ سحری ہے جو بجھا چاہتا ہے انگریزی برق رفتاری سے پورے ہندوستان پر قبضہ اور حکم رانی کے خواب دیکھ رہا ہے مسلمان امراء دولت اور اعضاؤ جوارحِ سلطنت اپنے ذاتی اقتدار، ذاتی مفاد اور خود غرضی کے دلدل میں ایسے پھنس چکے ہیں اب انھیں یہاں سے نکالنا اور سیاسی سنبھالا دینا دشوار بلکہ ناممکن نظر آتا ہے۔ ادھر دینی طور پر بھی مسلمان انتہائی تنزل وانحطاط کی نذر ہو چکے تھے۔ توہم پرستی شرک وبدعت اور غیر اسلامی رسم ورواج ان میں گھر کر چکے تھے۔ توحید وسنت سے گریز اور شخصیت پرستی ان کا وظیفہ حیات بن چکا تھا۔ جاہل مولوی اور جاہل پیران پر مسلط تھے۔ علمی وفکری طور پر یہ بالکل تہی کیسہ بلکہ یتیم ہو چکے تھے۔ الحاد اور بے دینی کو دین سمجھے ہوئے تھے۔ اخلاقی بیماریاں ان پر مستزاد تھیں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ حق پسندی اور حق گوئی کی یہ پوری قوت سے شدید مخالفت کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے دینی وسیاسی گھٹاٹوپ اندھیروں میں حضرت شاہ ولی اللہ جیسی حساس اور درد دل رکھنے والی شخصیت بھلا کب خاموش بیٹھ سکتی تھی چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے اپنی پوری قوت سے بے شمار مشکلات کے باوجود ان کو علمی وفکری سنبھالا دینے کی مساعی کا آغاز فرمایا۔ ان کے قلم معجز رقم سے نہایت قیمتی محققانہ اور انقلابی تصانیف منظر عام پر آئیں یوں شاہ صاحب نے ایک نئے علمی وفکری انقلاب کی طرح ڈالی جس کی مزید تکمیل ان کے واجب الاحترام فرزندان ارجمند حضرت شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالغنی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمتہ اللہ علیہم اجمعین نے فرمائی۔ اس انقلاب کو عملی جامہ پہناتے ہوئے شیر اسلام حضرت شاہ محمد اسماعیل شہید اور مجدد ومجاہد اعظم امیر المومنین حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمتہ اللہ علیہما نے اپنے خون مقدس سے بالاکوٹ کی وادی کو لالہ زار بنا دیا اور صفحہ عالم پر اپنے ایثار وقربانی کے غیر فانی اور لازوال نقوش ثبت کر دیئے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق!
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما!

۲۴ ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ رمئی ۱۸۳۱ء روز چہار شنبہ (بدھ) کو سانحۂ بالاکوٹ کے بعد تحریک مجاہدین کی عملی قیادت علماء صادق پور پٹنہ بہار بالخصوص مولانا ولائت علی مرحوم اور ان کے جانشین مولانا عبداللہ، مولانا رحمت اللہ، مولانا نعمت اللہ، مولانا عبدالرحیم، مولانا احمد اللہ، مولانا جعفر تھانیسری، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، مولانا محمد بشیر لاہوری، مولانا محمد علی قصوری رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ راقم الحروف کے والد جناب حاجی نور محمد مرحوم، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ولی محمد فتوحی والے بھی اس تحریک سے وابستہ رہے۔ یہ لوگ عُسر ویُسر کی حالت میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں ہمیشہ مستعدر ہے۔ انگریز جس کی سلطنت پر آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ ڈیڑھ صدی تک ربع مسکون پر دادِ حکم رانی دینے کے باوجود مٹھی بھر حق پسندوں اور مجاہدوں کی اس جماعت کو ختم نہ کر سکا آج بھی اس قافلۂ حریت کے میر کارواں حضرت صوفی عبداللہ صاحب مہتمم دارالعلوم اہل حدیث اوڈاں والا ضلع لائل پور کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اب انگریز ہر طرف سے مطمئن ہو کر اپنے رسوائے زمانہ ضابطہ سیاست ''پھوٹ ڈالو حکومت کرو'' کے ماتحت پوری دغابازی اور عیاری و مکاری سے ہندوستان کے قریباً اکثر حصوں پر قابض ہو چکا تھا۔ ادھر مجاہدین وطن اور محبان آزادی کا اضطراب برابر بڑھ رہا تھا فرنگی کے خلاف نفرت و بیزاری کے جذبات تیزی سے ابھر رہے تھے۔ جذبۂ حریت استخلاص وطن کے احساسات وجذبات کا طوفان ان سینوں میں موجزن تھا، عوام میں انگریز کے خلاف مسلح انقلاب کا لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا جو بالآخر ۱۸۵۷ء میں پھٹ پڑا اور سارے ملک میں آزادی کی مسلح تحریک چل نکلی۔ علمائے کرام اور دیگر مجاہدین وطن بلا امتیاز مذہب وملت پورے شعور واطمینان عزم وہمت اور صبر واستقامت کے ساتھ صف آرا ہو کر انگریز کے خلاف مصروف جہاد ہو گئے اگر ملت کے غداروں اور وطن فرشوں کی سازشیں اور جفا کاریاں نیز محبان آزادی میں باہمی نظم وضبط کا فقدان جیسی چیزیں آڑے نہ آتیں تو ہندوستان بھر سے فرنگی سامراج کا ٹاٹ یقیناً اسی وقت لپیٹ کر رکھ دیا جاتا اور ملک انگریز کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی کی نحوستوں سے بال بال بچ جاتا۔ حکیم احسن اللہ خان، رجب علی، غلام مرتضیٰ والد مرزا غلام احمد قادیانی متنبی کادیان ایسے ذلیل غداروں کی بدولت جنگ آزادی کا یہ آخری وار ناکام ہو گیا۔ فرنگی سامراج اور اس کے ازلی وابدی کاسہ لیسوں نے اس جہاد کا نام غدر (انگریزی حکومت سے بے وفائی) رکھا حالانکہ یہ تحریک آزادی کی ایک بھرپور اور شدید انگڑائی تھی غدر قطعاً نہ تھا ڈاکوؤں، لیٹروں اور بدمعاشوں کو ملک سے نکالنے کی تحریک کو غدر کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا۔

مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار سراج الدین بہادر شاہ ظفر مرحوم کے بیٹوں کو فرنگی ظالم نے وحشت و بربریت اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذبح کر ڈالا۔ بہادر شاہ ظفر کو اونٹ کی ننگی پیٹھ پر پابجولاں بٹھا کر رنگون (برما) کے طویل سفر پر بھیجا جا چکا تھا عروس البلاد دہلی اجڑ چکی تھی شاہراہ اعظم کے اونچے اونچے درختوں کے تنے مجاہدین وطن ومحبان آزادی کے لیے تختہ دار بنائے جا چکے تھے سقوط ہندوستان اور سقوط دہلی کا حادثہ اسلامیان عالم بالخصوص مسلمانان ہندوستان کے لیے سقوط بغداد اور سقوط اندلس (ہسپانیہ) سے کم نہ تھا۔ پورے ملک پر خوفناک سناٹا طاری تھا۔ فرنگی سامراج نے چوں کہ اقتدار ہندی

مسلمانوں سے چھینا تھا اسے ہر وقت مسلمانوں کے اٹھ کھڑے ہونے کا خطرہ لاحق تھا اس لیے وحشیانہ مظالم کا تختۂ مشق بھی مسلمان ہی تھے۔فرنگی شاطر نے اپنے مظالم کا دوسرا بڑا نشانہ علماء کرام کو بنایا چنانچہ کتنے ہی علماء کو پابہ زنجیر دریائے شور لا پانی عبور کرا کے جزائر انڈیمان میں قید کیا گیا۔بے شمار علماء اس گناہِ بے گناہی کے جرم میں تختہ دار پر کھینچ دیے گئے۔بہت سوں کو انبالا سازش اور قاضی کوٹ سازش کے نام پر فرضی مقدمات تیار کر کے حبس دوام کی سزائیں دی گئیں لیکن کیفیت یہ تھی کہ ؎

بڑھتا ہے ذوق جرم یہاں ہر سزا کے بعد

وہ نشۂ آزادی سے سرشار ہو کر تعذیب وعقوبت پر مسکرا رہے تھے۔قید و بند،کالا پانی،عبور دریائے شور،حبس دوام، تختۂ دار،قتل ونہب ،جائداد کی ضبطی کوئی بھی فرعونیت ان کو جادۂ حق سے نہ ہٹا سکی۔

اب ہندوستان پر انگریز بلا شرکت غیرے حکمران تھے، شیخ المشائخ ،حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی،مولانا شاہ محمد اسحاق،مولانا شاہ محمد یعقوب رحمتہ اللہ علیہم بھی ہجرت کر کے مکہ مکرمہ جا چکے تھے۔حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی،مولانا احمد علی محدث سہارن پوری،مولانا رشید احمد گنگوہی،مولانا عبدالحی لکھنوی،مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی،مولانا نواب سید صدیق حسن خان،مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی،مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری،مولانا سید عبداللہ غزنوی،مولانا محمد ابراہیم آروی،مولانا حافظ محمد لکھنوی،مولانا عبدالمنان وزیر آبادی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا اور مولانا محمد بشیر سہسوانی رحمتہ اللہ علیہم حالات وظروف کے مطابق مختلف مقامات پر علم کی مسندیں بچھا کر بیٹھ گئے اور پوری خاموشی،سکون اور یک جہتی سے دینی علوم کی تدریس شروع کر دی۔اسی طرح بعض دیگر ہمدردان ملت نے چند نظری اختلافات کے باوجود جدید دنیاوی تعلیم گاہوں کی بنیاد رکھی اور مسلمانوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی تدابیر پر عمل پیرا ہوئے۔

انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز پر ملک میں آزادی استقلال کے لیے آئینی تحریکیں شروع ہو گئیں اور مختلف جماعتوں کا قیام عمل میں آ گیا۔اسی طرح ملت کے دیگر علمی،ادبی،تبلیغی،تصنیفی،اصلاحی،قومی اور سیاسی محاذوں پر علمائے کرام کی خاصی بڑی تعداد مصروف عمل ہو گئی اس سلسلہ میں حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی،مولانا اشرف علی تھانوی،مولانا سید عبدالحی ندوی،علامہ شبلی نعمانی،خواجہ الطاف حسین حالی،مولانا محمد سعد بنارسی،مولانا عصمت اللہ جیراج پوری، مولانا حمید الدین فراہی،مولانا سید عبدالجبار غزنوی،مولانا محمد حسین بٹالوی،مولانا سید عبدالواحد غزنوی،علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری،حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری،مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری،مولانا عبدالسلام مبارک پوری،مولانا ثناء اللہ امرت سری،مولانا محمد جونا گڑہی،علامہ سید سلیمان ندوی،مولانا عبدالسلام ندوی،مولانا محمد ابراہیم سیال کوٹی،مولانا عبدالقادر قصوری،مولانا شمس الحق ڈیانوی،علامہ شبیر احمد عثمانی،علامہ ابوالقاسم بنارسی،علامہ نواب محسن انصاری یمنی،مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی،مولانا احمد سعید دہلوی،مولانا سید حسین احمد مدنی،مولانا اعزاز علی،مولانا عبداللہ الباقی،مولانا عبداللہ الکافی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین کی علمی،دینی،تبلیغی،اصلاحی،سماجی،قومی،سیاسی،تصنیفی،تدریسی،ادبی اور تحقیقی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

انیسوی صدی کے اختتام پر انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل ایک سماجی اور اصلاحی جماعت کے بھیس میں عمل میں آچکی تھی۔ جو بہت جلد ایک زبردست اور فعال سیاسی جماعت کی صورت اختیار کرگئی بیسویں صدی کے پہلے عشرہ میں ڈھاکا مشرقی پاکستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا جو اس وقت صرف نوابوں اور رئیس زادوں کی جماعت تھی اور ان مسلم روٗسا اور جاگیرداروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے عالمِ وجود میں آئی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد مسلم لیگ بھی ایک عوامی اور سیاسی جماعت بن گئی۔ اب غیر مسلم لیڈروں کے پہلو بہ پہلو امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، حکیم حافظ محمد اجمل خان، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا سید محمد داوٗد غزنوی اور مولانا حبیب رحمان لدھیانوی سیاسیات میں بھر پور حصہ لے رہے تھے اور ان کی انقلابی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال والبلاغ نے مولانا محمد علی جوہر کے کامریڈ اور ہمدرد نے اور مولانا ظفر علی خان کے زمیندار نے زوردار مقالات ومضامین کے ذریعہ مسلمانوں میں صور بیداری پھونکا اور انھیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے سلسلہ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جنھیں موٗرخ کا قلم کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اسی طرح علامہ اقبال مرحوم کے کلام اور تصنیفات نے نوجوانانِ ملت کی بیداری میں مہمیز کا کام دیا۔ یہ اعاظم رجال عباقرۂ زمانہ اور نوابغ عصر حضرات بذات خود ایک انجمن اور چلتے پھرتے ادارے تھے ان کے خاراشگاف قلم کی معجز نمائیوں، ادیبانہ دلآویزیوں، خطیبانہ سحر طرازیوں، عالمانہ وجاہتوں اور مجاہدانہ جلالتوں نے مسلمانو ں کو خوابِ غفلت سے جھنجوڑا اور خوئے غلامی کو توڑا۔ ان میں مطالبۂ آزادی کا عزم وحوصلہ پیدا کیا ان کو اپنے اصل مقام سے روشناس کیا اور ان میں ان کے شاندار ماضی اور عظمت رفتہ کو واپس لانے کے جذبات ابھارے۔ ان اکابر کی مخلصانہ مساعی کا یہ ردِعمل ہوا کہ مسلمانوں نے انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آزادیِ وطن کا مطالبہ کیا اور جہاد حریت میں شریک ہوگئے۔

۱۹۱۴ء میں افقِ عالم پر جنگ عظیم اوّل کے مہیب بادل چھاگئے فرنگی غاصب نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اکثر مسلم زعماء کو پابند سلاسل کردیا۔ انگریز نے جو جُوع الارض کا مریض تھا اپنی شاطرانہ چالوں سے جرمنی کے ساتھ ساتھ خلافت عثمانیہ (ترکی) کو بھی جنگ میں الجھالیا اور شرقِ اوسط بالخصوص عرب ممالک کو ترکی خلافت سے کاٹ کر ان کے تیل پٹرول اور جنگی محل وقوع کے پیش نظر ان پر خود قابض ہونے کے ناپاک منصوبے بنائے اور ذلیل سازشیں شروع کردیں حتیٰ کہ خاتمۂ جنگ تک ترکی سلطنت کے حصے بخرے کرکے متعدد ممالک عربیہ پر ظالمانہ تسلط جمالیا۔

۱۹۱۹ء میں جنرل اڈوائر نے امرت سر کے جلیاں والا باغ میں ایک خوفناک خونی ڈرامہ کھیلا بربریت وبہیمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چشم زدن میں مادر ہند کے ہزاروں بہادر سپوتوں کو اپنی خون آشامیوں کا نشانہ بنایا اور گولیوں کی باڑ سے ان کے سینے چھلنی کرڈالے۔ پنجاب مرحوم میں مارشل لاء نافذ کرکے داروگیر کی ایک ہیبت ناک فضاء قائم کردی اس وقت اکثر مسلم اکابر اور عمائد جیلوں میں محبوس تھے۔ مولانا عبدالباری فرنگی مرحوم نے لکھنوٗ میں جرأت کرکے ہندوستان بھر سے مسلم زعماء اور علمائے کرام کو مدعو کر

کے خلافتِ عثمانیہ کے تحفظ و بقاء کی تدابیر و تجاویز پر غور کرنے کی طرح ڈالی۔ اسی مقصد کے لیے ہندوستان میں ایک زوردار تحریک چلانے کے عزم کا اظہار کیا۔ چنانچہ مسلمانان پنجاب کی طرف سے مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحومین، ملک لعل خان اور آغا صفدر سیال کوٹی مرحوم اس میں شامل ہوئے، اسی وقت آل انڈیا مجلس خلافت قائم کر کے نئے آئینی سیاسی جدوجہد کا آغاز کر دیا گیا مجلس خلافت پنجاب کے پہلے صدر مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم منتخب ہوئے، حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم کی تحریک اور کوشش سے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور غازی عبدالرحمان امرت سری بھی تحریک میں شامل ہو گئے۔ مسٹر گاندھی اور دوسرے ہندوؤں نے مسلمانوں سے کامل اشتراک کیا لیکن لالہ لاجپت رائے قسم کے متعصب ہندو لیڈروں نے ہندو مسلم کے اس اتحاد کو فرنگی شاطر کے ایماء سے پارہ پارہ کرنے کی ناپاک کوششیں شروع کر دیں، دوقومی اختلافات کے سوال کو خوب ہوا دی تاکہ ملک میں ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو کر فسادات شروع ہو جائیں اور موجودہ خوش گوار فضا رغارت ہو کر رہ جائے نہرو رپورٹ نے کانگریس بالخصوص ہندو کی اصل ذہنیت کو بالکل بے نقاب کر دیا اور بعض کانگریسی ہندو لیڈروں نے متعصب ہندو جماعتوں کی کھلم کھلا سرپرستی اور حوصلہ افزائی شروع کر دی اس سے حساس اور مخلص بزرگوں کو شدید صدمہ پہنچا۔ ایسے سنگین اور نازک حالات میں ایک اولوالعزم بہادر مخلص، خالص عوامی اور اسلامی جماعت کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی تاکہ غیر مسلم جماعتوں کی زبردستیوں اور جارحانہ تحریکات کا ضروری سدباب اور مستقل محاذ پر انگریز کا مردانہ وار مقابلہ کیا جا سکے۔ یہ جماعت ملکی سیاسیات کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کے نفاذ اور حکومت الٰہیہ کے قیام کی علم بردار ہو جو پوری قوت جرات اور استقلال کے ساتھ آزادی وطن کی جنگ لڑ سکے، چنانچہ اسی غرض سے ۱۹۲۹ء میں مسلم بہادروں، اولوالعزم مجاہدوں، سربکف جانبازوں، عظیم الشان شجاعوں اور عظیم محبِ وطن انسانوں کی جماعت مجلس احرار اسلام ہند کے نام سے عالم وجود میں آئی۔ اس کے اولین بانیوں میں چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ظفر علی خان، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، غازی عبدالرحمٰن امرت سری، جناب شیخ حسام الدین اور جناب مولوی مظہر علی اظہر رحمۃ اللہ علیہم شامل تھے۔ راقم الحروف بھی تاسیس جماعت سے ہر ابتلا و آزمائش اور ہر تنگی و آسانی میں مجلس احرار اسلام سے وابستہ رہا ہے اور بحمد اللہ اب بھی اہل حق کے اسی جاں باز گروہ کا حامی اور خادم ہے۔

مجلس احرار اسلام ہند کا قیام عمل میں کیوں آیا؟ اس کے اسباب و وجوہ کیا تھے؟ اور پس منظر کیا تھا؟ اس کے اصول اور مقاصد کیا تھے؟ اس کی تنظیم کیسی تھی؟ اس کے کارکنوں کے کیا اوصاف و خصوصیات تھے؟ مجلس احرار کے قیام سے ملک خصوصاً پنجاب میں کیا ردِعمل ہوا؟ اور سیاسی قبرستانوں میں اس نے حق کی اذانیں کس طرح بلند کیں؟ اس کی سیاسی سماجی اور تبلیغی خدمات کا دائرہ کتنا وسیع تھا؟ اس کے ہمہ جہت قومی اور اسلامی کارناموں کی تفصیل کیا ہے؟ کشمیر ایجی ٹیشن، مغل پورہ ایجی ٹیشن، کپورتھلا ایجی ٹیشن، تحریک شہید گنج، تحریک مدح صحابہ، فوجی بھرتی بائیکاٹ وغیرہ میں اس کا کیا کردار رہا؟ اس کے جیوش کی شان و شوکت کا کیا عالم ہوتا تھا؟ احرار کی تبلیغی و سیاسی کانفرنسیں اور قومی اجتماعات کس قسم کے ہوتے تھے؟ انگریز نے اس پر کیا مظالم ڈھائے؟ ٹوڈی مسلمانوں انگریز کے کاسہ لیس رئیسوں اور غاصب جاگیرداروں نے اس سے کیا سلوک روا رکھا؟ کادیان کی لندن ساختہ

نبوت کا ذِبہ کا تار و پود بکھیرنے اور اس کے بخیے ادھیڑنے میں اس کا کیا طرز تھا؟ اور مرزائی ڈاکوؤں کے تعاقب میں اس کا طریق کار کیا تھا؟ اس نے مسئلہ ختم نبوت کا دفاع اور عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ کس انداز میں کیا؟ نیز زعماء اور کارکنوں کے سوانحی خاکے اور دیگر پوری تفصیلات ''تاریخ احرار'' کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں کہ جن کا اجمال اور خلاصہ مفکر احرار رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے مشکل وقت میں قلم بند کر کے ایک اہم فرض ادا کیا تھا۔ لیکن یہ تصنیف اور دوسرا بہت سا جماعتی لٹریچر عرصہ دراز سے زاویۂ خمول اور گوشۂ گمنامی میں پڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاسبانِ ختم نبوت حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین وفرزندِ اکبر حضرت مولانا حافظ سید ابومعاویہ ابوذر عطاء المنعم بخاری ناظم اعلیٰ مجلس احرار اسلام پاکستان نے مجلس کی تنظیم جدید کے بعد تاریخ احرار اور دوسرے جماعتی لٹریچر کی نئی اشاعت کا اہتمام کر کے اسلامیان برصغیر بالخصوص احرار حلقوں پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔ اس ضمن میں حافظ صاحب کے متعدد عظیم الشان علمی وتحقیقی شاہکاروں کی اشاعت سے بھی انشاء اللہ جماعتی تاریخ اور تحریک آزادی کے نہایت قیمتی باب ہمیشہ کے لیے محفوظ ومصئون ہو جائیں گے۔ سید ابومعاویہ یقیناً ہم سب کے شکریہ کے حق دار ہیں جن کی علمی وادبی کاوشوں اور جماعتوں کے لیے تقریری وتحریری خدمات سے ملک کا اہل علم طبقہ عظیم استفادہ کر سکے گا حافظ صاحب موصوف **الـولـد سـر لأبيـه** (بیٹا باپ کے رازوں کا امین ہوتا ہے) کا ایک عظیم مظہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو فصاحت وبلاغت، تقریر وخطابت، حق گوئی وحق پسندی، راست بازی وبے باکی، جرات وحوصلہ مندی، استقامت وعزیمت اور صبر وثبات کی بے بہا دولت سے نوازا اور سرفراز فرمایا ہے۔ قسام ازل نے موصوف کو تصنیف وتالیف کے پختہ ذوق کا سرمایہ بھی پوری فیاضی سے عطا فرمایا ہے۔ ان کے ادیبانہ قلم کی جولانیاں قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑتیں۔

قصہ مختصر...... زیر نظر کتاب بہ وقت تصنیف نامساعد حالات کی وجہ سے گو اپنے موضوع کا احاطہ نہیں کر سکی اور بعدازاں اس کے مصنف گرامی قدر جناب مفکر احرار چوہدری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے باعث مکمل صورت بھی اختیار نہ کر سکی۔ تاہم موجودہ حالات میں جبکہ مختلف قومی اور سیاسی حوادث وآفات نے جماعت کے دفتری نظام اور شعبۂ تصنیف واشاعت کو معطل کر دیا تھا، یہ کتاب رفقائے جماعت کے لیے ماضی کا عظیم ورثہ، حال کے لیے دلیل راہ، خصوصاً نوجوان نسل کے لیے احرار کے اخلاص وایثار، عزم وعمل، صبر وثبات، جہاد وقربانی اور شوق شہادت کے ایمان افروز مناظر سے رنگین تاریخ کے ساتھ تعارف وروشناسی اور مستقبل میں خالص اسلامی قیادت ورہنمائی کا الہامی صحیفہ ثابت ہوگی۔ نیز برصغیر ہندو پاک کی مختلف سیاسی ودینی تحریکوں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لیے اس کا مطالعہ بیش از بیش مفید ہوگا۔ والسلام۔ **وآخرُ دعوانا اَنِ الحمدُ للّٰہِ ربِ العٰلمین :**

عبید اللہ احرار، لائل پور
(سابق امیر مجلس احرار اسلام پاکستان)
بروز شنبہ ۱۷/۱۱/۱۳۸۷ھ/ مطابق: ۱۷/۲/۱۹۶۸ء

# مسافران آخرت

(ملتان) حضرت مولانا منظور احمد رحمۃ اللہ علیہ، استاذ حدیث جامع خیر المدارس ملتان، ۱۱ ذیقعد ۱۴۴۱ھ 3 جولائی 2020ء

(ملتان) مجلس احرار اسلام ملتان کے قدیم کارکن محمد یعقوب خان خواجکزائی، انتقال 9 جولائی 2020ء

(ملتان) ہمارے کرم فرما محمد فہیم خان ایڈووکیٹ کے ماموں، جون کے مہینہ میں انتقال کر گئے۔

(ملتان) روزنامہ اوصاف ملتان کے چیف رپورٹر رفیق قریشی کی خوشدامن صاحبہ گزشتہ دنوں انتقال کر گئیں۔

(اوکاڑہ) قدیم احرار کارکن مولانا اللہ بخش رحمہ اللہ کی صاحبزادی اور رانا محمد اکمل شہزاد (لاہور) کی پھوپھی انتقال 9 جولائی 2020ء

(چنیوٹ) مخلص احرار کارکن محمد صفدر کی والدہ گزشتہ ماہ انتقال کر گئیں۔

(لاہور) معروف اہل حدیث عالم مولانا حافظ صلاح الدین یوسف رحمہ اللہ۔ انتقال ۲۰ ذیقعد ۱۴۴۱ھ\12: جولائی 2020ء

(جھنگ) قاری محمد اصغر عثمانی کی والدہ محترمہ۔ انتقال: 20 جولائی 2020ء

(ڈسکہ) مجلس احرار اسلام ڈسکہ کے سرپرست، شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق کی والدہ محترمہ۔ انتقال: 18 جولائی 2020ء

(ڈسکہ) مجلس احرار اسلام دیرینہ کارکن شیخ محمد عزیر کے والد محترم شیخ محمد بشیر رحمہ اللہ

(گڑھا موڑ) مجلس احرار اسلام چک نمبر 100 کے کارکن محمد قاسم کے پھوپھا ذاکر حسین۔ انتقال: 3 جولائی 2020ء

(رحیم یار خان) معروف سیاسی و سماجی رہنما مولوی محمد طارق چوہان رحمہ اللہ۔ انتقال: ۸ ذیقعد ۱۴۴۱ھ 30\جون 2020ء

(تلہ گنگ) احرار کارکن بھائی محمد فہیم کے والد ماجد شیخ بابو محمد اصغر رحمہ اللہ، انتقال: 6 جولائی 2020ء

(راولپنڈی) مجلس احرار اسلام راولپنڈی کے امیر جناب خادم حسین کی والدہ، انتقال: 20 جولائی 2020ء

(لاہور) احرار کارکن قاضی حارث علی کی پھوپھی صاحبہ، انتقال: یکم جولائی 2020ء

(میانوالی) ہمارے کرم فرما حسیب اللہ خان کے بھائی حماد احسن خان، انتقال: 30 جون 2020ء

(ساہی وال) حافظ محمد شفیق رحمہ اللہ (گلاسگو برطانیہ) حضرت مفتی مقبول احمد رحمہ اللہ کے چھوٹے بھائی انتقال: 21 جون 2020ء

(چیچہ وطنی) قدیم احرار ساتھی حافظ محمد انور (چوک اعظم، لیہ) کے ماموں محمد پرویز، غفور ٹاون چیچہ وطنی میں 30 جون کو انتقال کر گئے

(چیچہ وطنی) حافظ محمد یوسف ہزاروی مرحوم چک نمبر (42-12 ایل) کی اہلیہ، محمد معاویہ، محمد سفیان، محمد عثمان کی والدہ ماجدہ اور مولانا نور محمد خطیب و امام مدینہ مسجد ساہیوال کی بھابھی صاحبہ 3 جون جمعۃ المبارک کو انتقال کر گئیں۔

(چیچہ وطنی) قاری شبیر احمد چک نمبر 181-9 ایل کی اہلیہ حضرت پیر جی عبداللطیف رائے پوری مرحوم کی صاحبزادی 8 جون منگل کو انتقال کر گئیں، مرحومہ عابدہ زاہدہ تھیں، تعلیم القرآن کا خاص ذوق تھا، حضرت پیر جی عبدالعلیم شہید کے دور نظامت جامعہ رشیدیہ ساہیوال میں مرحومہ کے ذریعے بنات کے درجے کا آغاز ہوا ایک عرصہ وہاں پڑھایا پھر قبل از بیماری تک چک 181 والے مدرسے میں پڑھایا، عبداللطیف خالد چیمہ، قاری محمد قاسم، رانا قمر الاسلام بھائی انوار الحق اور قاضی عبدالقدیر نے نماز جنازہ میں شرکت کی، جبکہ سید محمد کفیل بخاری تعزیت کیلئے حضرت پیر جی قاری عبدالجلیل رائے پوری اور قاری شبیر احمد کے ہاں تشریف لے گئے۔

(چیچہ وطنی) میر رضاء الدین احمد مرحوم چک نمبر 34-12 ایل کے خاندان کے چشم و چراغ اور علاقے کی ہردلعزیز شخصیت میر رضاء الدین احمد کچھ عرصہ علالت کے بعد 18 جولائی ہفتہ کو انتقال کر گئے، نماز جنازہ 19 جولائی اتوار کو 34-12 ایل میں ادا کی گئی، جو مرحوم کے بڑے فرزند میر کاشف رضاء نے پڑھائی، مرحوم کا بیعت کا تعلق خانقاہ سراجیہ سے تھا، مرکزی مسجد عثمانیہ کے مستقل نمازی اور جماعت کے معاون تھے سیاسی طور پر اپنی منفرد شناخت رکھتے تھے، مارکیٹ کمیٹی چیچہ وطنی کے چیئرمین کچھ عرصہ پہلے مقرر ہوئے، وضع داری، تواضع، مہمان نوازی اور خاندانی شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

(چیچہ وطنی) مجلس احرار اسلام کے ناظم اعلیٰ عبداللطیف خالد چیمہ کی چچی محترمہ، انتقال: 24 جولائی (قارئین اپنی دعاؤں میں مرحومین کو یاد رکھیں گے)

# خصوصی اشاعت

## ماہنامہ ''نقیب ختم نبوت'' ملتان

محسن احرار
ابن امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ

کی شخصیت و خدمات کے حوالے سے ان شاء اللہ العزیز خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے۔ تمام احباب، رفقاء و کارکنان احرار اور قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے تأثرات، مضامین، واقعات، منظوم کلام، خطوط اور یاداشتیں وغیرہ جلد از جلد دفتر ماہنامہ ''نقیب ختم نبوت'' ملتان کو ارسال فرما کر ممنون فرمائیں۔

امید ہے آپ حضرات اپنے قیمتی اوقات میں سے کچھ وقت نکال کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے

آپ اپنی تحاریر نیچے دیے گئے ای میل اور ڈاک کے ذریعے ارسال کر سکتے ہیں

دفتر ماہنامہ ''نقیب ختم نبوت'' دار بنی ہاشم مہربان کالونی ایم ڈی اے چوک ملتان

www.ahrar.org.pk / majlisahrar@yahoo.com / majlisahrar@hotmail.com

آ یئے! اللہ تعالیٰ سے دعا کے ساتھ سود اور سودی قرض کے خلاف جنگ کا آغاز کریں!

## ادائیگی قرض کی دعائیں

۱) ...... حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک غلام نے عرض کیا میں اپنے آقا کو رقم ادا کر کے جلدی آزادی چاہتا ہوں۔ آپ میری مدد فرمائیں۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”میں تجھے دو کلمے سکھلا دیتا ہوں جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سکھلائے تھے۔ اگر تجھ پر پہاڑ کے برابر بھی قرض ہوگا اللہ تعالیٰ ادا کر دے گا۔ وہ کلمات یہ ہیں:

**اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِیْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ۔**

”الٰہی! حاجتیں پوری کر میری حلال روزی سے اور بچا حرام سے اور بے پروا کر دے مجھ کو اپنے فضل کے ساتھ اپنے ماسوا سے۔“ (مشکوٰۃ باب الدعوات فی الاوقات فصل دوم)

۲)...... حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص مقروض ہو گیا تھا۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہیں وہ کلام سکھلا دیتا ہوں کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ تیرا غم دور اور قرض ادا کر دے گا، صبح وشام یہ دعا پڑھا کرو:

**اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْھَمِّ وَالْحُزْنِ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ وَالْجُبْنِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ غَلَبَةِ الدَّیْنِ وَقَھْرِ الرِّجَالِ۔**

”اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں فکر وغم سے اور آپ کی پناہ چاہتا ہوں ناتوانی اور سستی سے اور بچاؤ چاہتا ہوں آپکے ساتھ بخل اور بزدلی سے اور پناہ میں آتا ہوں آپ کی قرض کے غلبے اور لوگوں کے سخت دباؤ سے۔“ (مشکوٰۃ باب الدعوات فی الاوقات فصل دوم)

مرتبہ مولانا **محمد امین** مرحوم معلم اسلامیات، فیصل آباد